UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222133
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱/۵۹ ۳۳۳ Accession No. ۱۵۲۷۹ 15279

Author 891.4393

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

زخم

"ناول"

آغا اشرف

حیدرآباد بک ڈپو، حیدرآباد دکن۔

پبلشرز
کتابستان اردو
اندرون لوہاری گیٹ لاہور

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

پنجاب نیشنل پریس لاہور میں باہتمام سردار گوردیال سنگھ پرنٹر چھپا۔

دل میں کوئی آرزو باقی نہیں
زخم ہے لیکن لہو باقی نہیں

(۱)

پروفیسر مرزا کی پہلی بیوی بانجھ تھی۔ اس نے اپنی گود کو آباد کرنے کے لاکھ جتن کئے۔ حکیموں اور سنیاسیوں سے جڑی بوٹیاں لیکر کھائیں۔ اپریشن کروایا۔ منتیں مانیں خانقاہوں پر گھی کے چراغ جلائے۔ جی بھر کر خیرات دی۔ چلہ کشی کی۔ تعویذ گنڈا ٹونہ ٹوٹکا غرضیکہ جو کچھ سمجھ میں آیا کیا۔ لیکن قسمت کا لکھا نہ مٹا۔ اولاد نہ پیدا ہونی تھی نہ ہوئی۔ بیچاری اسی غم میں گھل گھل کر مر گئی۔ اور پروفیسر مرزا چند ہی ہفتوں میں ایک سولہ سالہ مہ جبیں بیاہ لایا۔

دوسری شادی کی ضرورت ضرور تھی عمر نہ تھی۔ ساٹھ سے اوپر سن تھا۔ گوشت ہڈی کو چھوڑ چکا تھا۔ کس بل نام کو نہ تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور سر کے بال سپید ہو چکے تھے۔ پروفیسر مرزا کے اللہ اللہ کرنے کا زمانہ تھا لیکن دل کی لگی نے کسی طرح چین نہ لینے دیا۔ وہ اولاد کا بھوکا تھا۔ جو اسکی موت کے بعد اسکی جائداد کی وارث بنے اور اسکے نام کو زندہ رکھے۔ یہی آرزو ساٹھ سال کی عمر میں ایک بار پھر دولہا بننے کی محرک ہوئی۔ ورنہ پروفیسر

مرزا ایسا دور اندیش اور جہاں دیدہ شخص عقل کی موجودگی میں اور بڑھاپے کے احساس کے ہوتے ہوئے ایک نوخیز دوشیزہ سے شادی کرنے کی غلطی کبھی نہ کرتا۔ خواہشات کے جال میں پھنس کر انسان بالکل دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کچھ نہیں سوچتا کچھ نہیں سمجھتا۔ عقل کے سارے دریچے بند کر لیتا ہے۔ اور خواہشوں کے بہکانے پر بے فائدہ وقت اور قسمت سے الجھتا ہے۔

پروفیسر مرزا مقامی کالج میں بوٹنی کا پروفیسر تھا تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ اور کچھ جائداد خاندانی ورثہ میں پائی تھی۔ رہنے سہنے کو عالیشان کوٹھی اور خدمت کرنے کو نوکر چاکر موجود تھے۔ اس لحاظ سے وہ بہت خوش نصیب تھا دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک وہ جنکے لئے آسمان پر سے من و سلوے اترتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو معاش کی تلاش میں بھوکے کتوں کی طرح زندگی کے نشیب و فراز میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ پہلے درجے کے لوگوں کے لئے یہ دنیا جنت ہے۔ انکے نیک اعمال کا صلہ۔ اور دوسرے درجے کے لوگوں کے لئے جہنم۔ یہاں پہلی زندگی میں کئے ہوئے برے کرموں کی سزا بھگتنے آتے ہیں۔ پروفیسر مرزا نے پہلی زندگی میں معلوم نہیں کونسے ایسے اچھے کرم کئے۔ کہ دوسری زندگی میں اسے پہلے درجے کے لوگوں میں پیدا کیا گیا۔ جن پر من و سلوے اترتا ہے۔ جو معاش کی الجھنوں سے آزاد ہیں۔ بالکل آزاد۔

پروفیسر مرزا کی نئی نویلی دلہن کا نام جمیلہ تھا۔ وہ بہت حسین و جمیل تھی۔

ستاروں سے زیادہ حسین اور چاند سے زیادہ جمیل۔ نقاشی فطرت نے اسے عالم فراغت میں بنایا تھا۔ اور اپنی تمام صناعیاں اس پر ختم کر دی تھیں۔ اسے بناتے وقت نقاسی فطرت نے چاند سے نور۔ ستاروں سے چمک۔ شفق سے سرخیاں پھولوں سے نکہت بجلی سے تڑپ۔ گھٹاؤں سے مستی۔ صبا سے نزاکت۔ لہروں سے لوچ۔ طاؤس سے نخوت۔ کوئل سے رس۔ اور ہیجے سے خلش لیکر اسکے پیکر مرمری میں بھر دی تھی۔ وہ نقاشی فطرت کا شاہکار تھی۔ لانبے لانبے کالے بال کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے۔ کشادہ پیشانی چاند سا سفید اور گلگوں چہرہ۔ بھونرہ سی کالی بڑی بڑی موہنی آنکھیں۔ گھنی خمدار پلکیں جیسے جیل پر صنوبر کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں۔ بلند اور ستواں ناک۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ۔ جو مسکراتے وقت ایک طلسمی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ غنچہ سا دہانہ۔ خوبصورت بتیسی۔ آہو کی سی گردن۔ ابھرتا سینہ۔ باریک کمر۔ اور ابھرے ہوئے گداز کولہے سر سے لیکر پاؤں تک سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ ایک ایک عضو موزوں و متناسب ہنستی تو دہن سے پھول جھڑتے۔ بولتی تو لبوں سے زمزمے برسنے لگتے۔ انسان نہ تھی قیامت تھی انسانی قالب میں اگر اس وقت مانی و بہزاد زندہ ہوتے۔ اور اسے کہیں دیکھ پاتے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے۔ انہیں اپنے نگار خانۂ خیال کے سب نقش پھیکے اور بے رنگ نظر آنے لگتے۔ اور انکا موقلم انتہائے حیرت سے ایک مستقل لرزش بن جاتا۔

پروفیسر مرزا کو جمیلہ سے اتنی ہی محبت تھی۔ جتنی چکور کو چاند سے۔ پتنگے کو شمع سے۔ اور بھونرے کو پھول سے ہے۔ وہ اسکی زندگی بھی اور سب کچھ جمیلہ کو آغوش میں لیتے ہی اسکی نظریں خود بخود آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ سرد آہ بھرتا اور نامعلوم کن خیالوں میں کھو جاتا۔ اسکے دل میں ماضی کی یاد چٹکیاں لینے لگتی۔ اور آنکھوں میں شباب رفتہ کی تصویر کھنچ جاتی۔ جمیلہ اسے اسوقت ملی جبکہ ساز جوانی ٹوٹ گیا۔ اسکے تاروں میں کوئی نغمہ باقی نہ رہا۔

سوکھے ہوئے درختوں میں ایک نئی زندگی۔ نیا جوبن۔ نئی ترنگ پھونکنے کے لئے بہار ہر سال آتی ہے۔ نئے ولولوں نئی ترنگوں میں گھری ہوئی بہار ہر سال آتی ہے سوکھی ہوئی شاخیں ہری ہو جاتی ہیں۔ کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کلیاں چٹکتی ہیں۔ غنچے مسکراتے ہیں۔ پھول ہنستے ہیں۔ سارا گلشن مہک اٹھتا ہے۔ ہر طرف زندگی ہی زندگی۔ شباب ہی شباب نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ دبی ہوئی دھول کے بیچ میں سے بھی گھاس کے انکھوے اُگ آتے ہیں۔ لیکن انسان کی جوانی کی پھلواڑی میں بڑھاپے کی خزاں ایسی آتی ہے کہ جاتی ہی نہیں یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ کبھی نہ بدلنے والا کلیہ۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو پروفیسر مرزا انسان کی بجائے درخت ہوتا۔ بہار آتی۔ کونپلیں پھوٹتیں۔ شگوفے نکلتے۔ کلیاں چٹکتیں۔ پھول کھلتے۔ خوشنما طائر آتے۔ پھولوں سے کھیلتے۔ پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے شاخ شاخ

پڑنا چہتے پھرتے۔ ڈالی ڈالی پھدکتے ہوئے چہکتے۔ دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی ہوائیں چلتیں غنچوں کو گدگداتیں۔ شاخوں سے اٹکھیلیاں کرتیں۔ لیکن خالق نے پروفیسر مرزا کو انسان بنا دیا مجبور و مقہور انسان۔ کتنا ظلم کیا۔ خالق کتنا بخیل ہے۔ گندم کا ایک دانہ کھانے پر جنت سے نکالا۔ اس خرابے میں پھینک دیا زندگی کی تمام آسودگیاں چھین لیں مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ ایک دل دیا ہزار داغ۔ ایک زندگی عطا کی۔ لاکھوں بلائیں۔ ایک طرف تو اتنی فیاضی دکھائی کہ پروفیسر مرزا کو دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال کر دیا۔ اور دوسری طرف اتنے بخل سے کام لیا۔ کہ اولاد سے محروم رکھا۔ کیا تھا جو ایک بچہ بھی دے دیتا۔ خوبصورت نہ سہی بدصورت ہی سہی۔ بہرہ گونگا اور اندھا ہی ہوتا۔ کچھ دیا تو ہوتا۔ پروفیسر مرزا کی زندگی میں فقط ایک آرزو کی اور وہ بھی پوری نہ ہوئی۔ اور سب سے بڑا ظلم تو یہ کیا۔ اس سے جوانی بھی چھین لی۔ وہ ایک سہارا بھی نہ رہنے دیا۔ امید کی اس ننھی سی کپکپاتی ہوئی کرن کو بھی مٹا دیا۔ کتنا ظلم کیا۔ پہلے اولاد کا رونا تھا۔ اب اسکے ساتھ ہی جوانی کا ماتم کرنا پڑا اسے کاش وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس دنیا میں پیدا ہونا بھی گناہ ہے۔ جرم ہے۔ عذاب ہے۔

تصویر خانہ عالم کی تمام تصویریں خالق کی شوخئ تحریر کی فریادی ہیں۔ کہ اس نے انہیں بنا کر کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی سکھی نہیں۔ سب مصیبتوں کے جالے میں پتنگوں کی طرح پھنسے

ہوئے ہیں۔ ہر وقت اُنکا خون چوسا جاتا ہے۔ یہ متبسم چہرے۔ یہ ہشاش بشاش شکلیں دراصل ایک تلخ و ناگوار حقیقت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ ان مسکراہٹوں کے پردے میں نالے چھپے ہوئے ہیں۔ حقیقی خوشی اگر کوئی شے ہے تو کسی اور دنیا میں ہوگی۔ یہاں کہاں۔ زندگی غم ہے۔ مصیبت ہے پریشانی ہے۔ سب ایک دھندے سے تصور پر جیئے جاتے ہیں؟

پروفیسر مرزا کو ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کہ اسکا بڑھاپا اور جمیلہ کی اٹھتی جوانی کوئی گل نہ کھلائے برفائے ہوئے بال۔ مرجھایا ہوا چہرہ۔ بے نور آنکھیں نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ اسکی شکل وصورت کو دیکھ کر اپنی طرف دیکھتے ہوئے جمیلہ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ دل میں شیطان سماتے دیر نہیں لگتی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جمیلہ کے دل میں گھر کر سکے اسے اپنانے میں کامیاب ہو جائے۔ جمیلہ کے سینے میں بھی محبت کی وہی مقدس آگ روشن ہو۔ جو اسکے سینے میں ہے۔ زندگی کا حقیقی لطف تو جبھی آتا ہے کہ رفیقہ حیات بھی دل سے چاہے۔ دکھاوے کی محبت کی تو کیا کی۔ اس سے زندگی کا حقیقی لطف جاتا رہتا ہے۔ اور وہ مدسیقی فنا ہو جاتی ہے۔ جو دو دلوں کی جنبش باہمی سے پیدا ہوتی ہے۔

وہ خاوند جسکی بیوی اسے دل سے نہیں چاہتی۔ دکھاوے کی محبت کرتی ہے۔ زندگی کا حقیقی لطف نہیں اٹھاتا۔ زندگی کا مقصد عورت

مرد کے جنسی تعلقات پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اسکا ایک اور مدعا بھی ہے۔ نہایت ہی پاکیزہ۔ بہت ہی بلند۔ پروفیسر مرزا کی دلی خواہش تھی۔ کہ زندگی کا وہ نہایت ہی پاکیزہ۔ بہت ہی بلند مدعا پورا ہو۔ وہ جمیلہ میں سما جائے جمیلہ اس میں۔ ڈانڈ اسکے ہاتھ میں ہو پھوار جمیلہ کے ہاتھ میں۔ دونوں سفینۂ عمر پر پہلو سے پہلو ملائے بہتے چلے جائیں۔ بہتے چلے جائیں۔

پہلی بیوی کی زندگی میں پروفیسر مرزا پڑا کنجوس ہوا کرتا تھا۔ کچی کوڑی تک فضول خرچ نہ کرتا تھا۔ لیکن نئی نویلی دلہن کے دل کو رام کرنے کے لئے اس نے اپنے دفینوں کو ہوا دی۔ دنیا کی ہر وہ چیز جسے دولت سے خریدا جا سکتا تھا جمیلہ کے لئے خریدی گئی۔ لیکن بات کسی طرح بھی بنائے نہ بنی۔ جمیلہ کو اسکی دولت سے دلی نفرت تھی۔ اسکی دولت جمیلہ کا دل نہ خرید سکی۔ وہ دولت کی بجائے ایک جوان دل چاہتی تھی۔ جسمیں جوان امنگیں ہوں۔ اور جوان ولولے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت ایندھن کی طرح سلگتی رہتی تھی۔ نہ دن کو آرام تھا نہ رات کو چین۔ سونا سوگند ہو گیا تھا ساری رات تارے گنا کرتی تھی۔ اور اپنے بیدرد ماں باپ کی جان کو کوستی رہتی تھی۔ جنہوں نے دولت کے لالچ میں اسے سانس لیتی ہوئی قبر میں دفن کر دیا۔ وہ ہر وقت اس ظالم سماج کے خلاف خوفناک منصوبے گھڑتی رہتی تھی۔ اس ظالم سماج کے خلاف۔ جو عورت کے

حقوق کی ذرا پرواہ نہیں کرتی۔ جسکے قوانین عورت کو جکڑنے والی زنجیریں ہیں آہنی زنجیریں۔ کتنی ظالم ہے یہ سماج۔ اور اسکے قوانین۔ آجتک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی نوجوان کی شادی اسی سالہ بوڑھی عورت سے ہوئی ہو۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کہ ایک سولہ سالہ دوشیزہ کی شادی اسی سالہ بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ کردی جاتی ہے۔ جو دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ موت کے قدموں کی آہٹ سنتا ہے۔ جسکی زندگی بجھتے ہوئے چراغ کی طرح ہے۔ نہ جانے کب بجھ جائے۔ کیا یہ ظلم نہیں؟ نوجوان لڑکی اپنے سینے میں دل نہیں رکھتی؟ کیا اسکے دل میں ارمان اور امنگیں پیدا نہیں ہوتیں؟ کیا سماج کو معلوم ہے۔ کہ اسکی ناانصافی، لاپرواہی اور کوتاہ نظری سے آجتک کتنے سہاگ اجڑے؟ کتنے جنازے اٹھے؟ کتنے مرگھٹ دہک کر سرد ہو گئے؟ کتنی جانیاں بگولہ بن کر ہواؤں میں منتشر ہو گئیں؟

(۲)

سائے ڈھل چکے تھے۔ سورج کے آس پاس ہلکے پھلکے رنگین بادل اڑتے پھر رہے تھے۔ سامنے کپکپاتا ہوا رفیع اپنا بیکراں آغوش کھولے سورج کا منتظر تھا۔ ہوائیں پھر پھرا رہی تھیں اور سرسراہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے پاس کوٹھی کے باغیچے میں مولسری کے پیڑ کی پھننگ پر دو پرندے بیٹھے کلیلیں کر رہے تھے۔ کبھی نر مادہ کی گردن کو چونچ سے کھجاتا تھا۔ کبھی مادہ نر کی چونچ چونچ ملا کر گردن ہلاتی تھی۔ اور پروں کو ہولے ہولے پھر پھراتے ہوئے چہکتی تھی۔

جمیلہ کھڑکی میں کھڑی بڑے غور سے ان پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ کاش اسکا رفیق حیات بھی من کی مرضی کا ہوتا۔ جسے وہ دل سے چاہتی۔ پھر وہ ان پرندوں کی طرح پیار کرتے۔ کبھی نہ تھکتے۔ کبھی نہ اکتاتے۔ پیار کئے جاتے۔ کتنا لطف آتا زندگی کا کتنی پیاری نظر آتی یہ دنیا اور اسکے مناظر۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے۔ دونوں کے دل ایک ہی لے میں تھرکتے۔ ایک ہی دھن میں گنگناتے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک

لمحہ کے لئے بھی جدا ہونا گوارا نہ کرتے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ پہلو سے پہلو ملائے۔ محبت کے نشے میں مدہوش بیٹھے رہتے۔ خاموش بیٹھے رہتے جمیلہ بے اختیار رونے لگی۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے نہ جانے کیوں پھوٹ پڑے۔ کیا ہی اچھا ہو جو شام کے دھندلکے اسے اپنی پراسرار خاموشیوں میں چھپالیں۔ اگر رفیق حیات من کی مرضی کا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ دنیا اور اسکی بے شمار انگنیاں مخصہ بے سود ہیں۔ اور خمیازہ بے مزا۔ وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سی محسوس کر رہی تھی۔ اداس سونی سی خلا۔ جس میں نہ ہواؤں کا ترنم تھا۔ نہ ستاروں کی جگمگاہٹیں۔ فقط خاموشی اور تاریکی تھی۔ بھیانک۔ ہولناک۔ دولت بے معنی چیز ہے۔ انسان دنیا میں دولت کی پرستش کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے محبت۔ محبت۔ محبت زندگی کی زندگی ہے۔ یہ چاند یہ تارے یہ آکاش، یہ بادل، یہ ندیاں، یہ دریا، پہاڑ، یہ سمندر ایک وقت ایسا آئے گا۔ کہ فنا ہو جائینگے۔ کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ ہر طرف کبھی نہ ٹوٹنے والی خاموشیاں چھا جائیں گی۔ اور اسوقت جبکہ کچھ نہ ہوگا سب کچھ فنا ہو چکا ہوگا محبت باقی ہوگی۔ محبت زندہ ہوگی۔ ان کبھی نہ ٹوٹنے والی خاموشیوں میں نغمہ محبت گونج رہا ہوگا۔ نغمہ محبت۔

پرندے اڑ گئے۔ پھننگ خالی پڑی تھی۔ لیکن آنسو تھے کہ جمیلہ

کی آنکھوں میں بہتے چلے آتے تھے۔ امنڈتے چلے آتے تھے۔ رکتے ہی نہ تھے۔

آسمان کے کنارے پر پہلا سنہری ستارہ نکل آیا تھا ہواؤں میں ایک دلفریب ترنم اور نیند آور جھنجھناہٹ مچی جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان کے کنارے پر تھرکتے ہوئے ستارے سے یہ ترنم یہ جھنجھناہٹ ٹپک ٹپک کر ساری دنیا پر پھیلتی جا رہی ہے باغیچے کے شگفتہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں آنے لگیں۔ جمیلہ کی نس نس سے چنگاریاں چھوٹ نکلیں۔

ایکا ایکی دروازے کے قریب قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ جمیلہ نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور مڑ کر پچھلی طرف دیکھا سامنے پروفیسر مرزا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمیلہ کی آنکھوں میں جیسے کسی نے سوئیاں چبھو دیں۔ دل میں ہوک سی اٹھی۔ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ اسکے جذبات سہم کر نہ جانے دل کے کس سنسان کونے اوندھے منہ گر پڑے اور سسکنے لگے۔ آج اسے اپنے شوہر میاں کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔ اسکی صورت اور بھی مسخ ہو چلی تھی۔ جمیلہ کا دم گھٹنے لگا۔ اسکی نظروں میں کائنات کے افقی کنارے سمٹے چلے جاتے تھے۔

"تمہاری پلکیں بھیگی ہوئی کیوں ہیں"؟ پروفیسر مرزا نے قریب آکر محبت بھرے لہجہ سے پوچھا۔ "آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا۔" جمیلہ نے آنکھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر۔ دیکھوں تو کیا ہے"؟ پروفیسر مرزا نے آغوش محبت کھولتے ہوئے کہا۔ "یہاں آؤ۔" پروفیسر مرزا کا آغوش اسے موت کے خوفناک درندے کا دہانہ معلوم ہو رہا تھا۔ چپ چاپ وہیں کھڑی رہی۔

"برسات کے موسم میں ہوا میں چھوٹے چھوٹے پتنگے اڑتے رہتے ہیں۔" پروفیسر مرزا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اکثر آنکھوں میں پڑ جاتے ہیں کل ایک میری آنکھ میں بھی پڑ گیا تھا۔ خوب ہی آنکھ کو ملا۔ رومال سے اچھی طرح پونچھا۔ لیکن وہ نہ جانے آنکھ کے کسی کونے میں دب کر بیٹھا تھا۔ کہ نکلتا ہی نہ تھا۔ آخر تنگ آکر پانی کے چھینٹے مارے تو چین پڑا۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ دھرتی کے سینے سے مہیب چیخیں بلند ہو رہی ہیں "کیا ہی اچھا ہو جو یہ آنکھیں اندھی ہو جائیں یہ کان بہرے ہو جائیں۔" جمیلہ نے دل ہی دل میں کہا۔

"تیری صورت تو نظر نہ آئے گی۔ تیری آواز تو سنائی نہ دے گی۔"

"بالکل چیونٹی کی سی شکل و صورت کے ہوتے ہیں یہ پتنگے۔" پروفیسر مرزا پھر بولا۔

"بس فرق اتنا ہوتا ہے۔ کہ چیونٹی کے پر نہیں ہوتے اور انکے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو سفید پر۔ آنکھ میں پڑتے ہی کھجلی ہونے لگتی ہے اور پانی بہتا ہے۔"

جمیلہ کی رگوں میں سانپ ہی تو رینگنے لگے۔ چپ چاپ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اسکا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ سر کے بال نوچ ڈالے۔ کپڑے پھاڑ دے۔ اور چیختی ہوئی کمرے سے بھاگ نکلے۔ کسی سنسان ویرانے کی طرف۔ جہاں کوئی نہو۔ پیٹے تو کوئی ہاتھ نہ پکڑے۔ روئے تو کوئی آنسو نہ پونچھے۔ اس ویرانے کی ناپیدا کنار وسعتوں میں چیختی پھرے۔ اور چیختے چیختے دم توڑ دے۔

پروفیسر مرزا صوفے پر بیٹھ گیا۔ بولا۔ "میرے پاس آجاؤ۔ یہاں۔ میرے قریب۔"

جمیلہ بوجھل قدم اٹھاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اور صوفے کے قریب پہونچ کر کھڑی ہوگئی۔ پروفیسر مرزا نے اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھالیا۔ اور محبت بھری نظروں سے اسکے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جمیلہ سر جھکائے نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسکا جی یہی چاہتا تھا۔ کہ چیخ چیخ کر کسی سے پوچھے۔ آخر کیوں؟ اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان کیوں جمع ہوتا رہتا ہے؟ اسکی روح کے

ویرانے میں بادل کیوں گرجتے ہیں؟ بجلیاں کیوں چمکتی ہیں؟ آندھیاں کیوں اٹھتی ہیں؟ کیا اسکے لئے اپنی روح کے ہولناک ویرانے کی ویرانیاں ہی کافی نہیں؟ خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے مرغزادوں کی تمنا کیوں ہے؟ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟ جذبات کا سیلاب ہر وقت اسکے سینے کی دیواروں سے کیوں ٹکراتا رہتا ہے اور پھر نہ جانے کیوں ریت کا تودہ بنکر رہ جاتا ہے۔ آنسو بنکر آنکھوں سے بہہ جاتا ہے۔ دھواں بنکر لبوں کے راستے سے ہواؤں میں گھل مل جاتا ہے۔ اور پھر وہی ہلکی ہلکی چبھنیں۔ تھرتھری۔ کپکپاہٹ۔ بے چینی۔ اسوقت اسکی نگاہ میں مخملی صوفے اور نرم غالیچے کھٹک رہے تھے کیا ہی اچھا ہو جو صوفہ ایک آہنی شکنجہ بنکر اسے چاروں طرف سے کس لے۔ اور وہ نڈھال ہو کر جا پڑے شاید اسی لئے اس نے نواڑ کا پلنگ اپنے کمرے سے اٹھوا دیا تھا۔ جو اسے جہیز میں ملا تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ اس عالیشان کوٹھی کی بجائے کسی بھدے مٹی کے مکان میں رہتی ہو۔ جس میں اس ملائم سازو سامان کی بجائے کھردری اور بھدی چیزیں پڑی ہوں۔ کھردرے کھاٹ اور کھردرے پیڑے۔ صوفوں کی بجائے لکڑی کی بوسیدہ اور پرانی چوکیاں ان غالیچوں اور دریوں کی بجائے پھٹی پرانی اوڑھنیاں جن میں جا بجا پیوند لگے ہوئے ہوں۔ جہاں چینی کے برتن نہوں۔ مٹی

کے ٹوٹے پھوٹے کائی لگے ہوئے مٹی کے پیالے گھڑے اور ہانڈیاں پڑی ہوں۔ جہاں نوکر چاکر اور لونڈیاں باندیاں نہوں۔ اور وہ ہر روز گھر کا کام کاج کرتے کرتے ہار جایا کرے۔ تھکاوٹ سے اسکا بال بال دُکھنے لگے اور وہ بیہوش ہو کر کسی کھردری کھاٹ پر جا پڑے۔ یہ پریشان کر دینے والی چیخیں ختم ہو جائیں۔ اور پھر وہ آیا کریں۔ جوانی کے رنگوں سے چمکتا ہوا چہرہ۔ بے پرواہ غصیلی آنکھیں۔ بے رحم سخت ہاتھ۔ اسکی نرم و نازک کلائی کو پکڑ لیں۔ دو مضبوط بازو اسے آغوش میں لے لیں۔ اسکا سر ایک چوڑی چھاتی پر جا لگے۔ اسکے بدن میں ہوائیاں اڑنے لگیں اور حلق میں آ اٹکیں۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں جسم سن سا ہو جائے۔ ہلکی سی چیخ گلے سے نکلے۔ سانس اکھڑ جائے سکیاں لینے لگے۔ آسمان پر ستارے ایکدوسرے سے ٹکرا کر پھلجڑی کی طرح گرنے لگیں۔ مضبوط ہاتھ اسکا منہ موڑے۔ اسکے لبوں پر شہد کے قطرے ٹپکنے لگیں۔ چڑھی ہوئی پتلیوں میں ایک پر رونق چہرہ اسکی مخمور آنکھوں کے سامنے جھلکے۔ وہ پھر چونک پڑے۔ دیوتا مسکرائے۔ داسی اپنے حسن کے رنگین و شگفتہ پھول اسکے چرنوں میں بکھیر دے۔ ٹن ٹن ٹن۔ جھن جھن جھن۔ محبت کے مندر کی نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں چاندی کے دیئے جھلملا اٹھیں۔

اور انکے جھلملانے سے ایک سرسراہٹ سی پیدا ہو۔ جیسے کہ بہار کی میٹھی میٹھی دھیمی دھیمی معطر ہواؤں کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی رگ رگ میں طوفان اٹھے۔ بڑھے، جسکی شدت اسے ادھ موی کرکے پھینک دے۔ اور وہ یوں اس گرم سینے سے چمٹ جائے ۔ جیسے کوئی طوفان زدہ ناؤ ساحل سے جا چمٹتی ہے۔

"تم سے ایک بات پوچھوں جمیلہ؟" پروفیسر مرزا نے جمیلہ کے رخساروں سے الجھتے ہوئے بالوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔" وہ مدت سے میرے دل میں ہے۔ آج چاہتا ہوں کہ تم سے کہہ ہی دوں۔"

جمیلہ نظریں جھکائے خاموش رہی۔ اور اسکے جواب میں سر ہلا دیا۔

"تم ہر وقت اداس کیوں رہتی ہو؟" پروفیسر مرزا نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب سے تم بیاہی آئی ہو۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھا کبھی گنگناتے نہیں سنا۔ تمہیں کسکا غم ہے؟ کس چیز نے پریشان کر رکھا ہے؟ اداس کیوں رہتی ہو؟ تمہارے چہرے کی شفق کو شرما دینے والی سرخیاں کیا ہوئیں؟ دن بدن زرد ہوتی جارہی ہو؟ کیا کسی پوشیدہ روگ کا شکار تو نہیں

ہو تم؟"

پروفیسر مرزا متجسس نظروں سے جمیلہ کو تک رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش تھی۔

"جمیلہ" پروفیسر مرزا لمحہ توقف کے بعد پھر بولا۔

"بولتی کیوں نہیں؟ جواب دو میری بات کا"

"مجھے کوئی غم نہیں اچھی" جمیلہ نے دبی آواز سے کہا۔

"مجھے کوئی روگ نہیں"

"دل کی بات چھپاتی ہو مجھ سے" پروفیسر مرزا نے کہا۔

"اور یہ اچھی بات نہیں"

"نہیں اچھی میں آپ سے دل کی بات نہیں چھپا رہی"

جمیلہ نے کہا "مجھے کوئی غم نہیں۔ کوئی روگ نہیں۔ آپ اپنے دل میں ایسے ویسے خیالات پیدا نہ کیا کریں"

پروفیسر مرزا نے جمیلہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اور کہنے لگا۔

"میری زندگی کی رونق۔ تمہاری پوشاکیں صندوقوں میں ویسی ہی دھری ہیں۔ گہنوں کو تم نے کبھی چھوا تک نہیں۔ یہ عمر اور ان چیزوں سے نفرت آخر کیوں؟"

"میں سادہ زندگی کو پسند کرتی ہوں اچھی۔" جمیلہ نے کہا۔ "سادہ زندگی اچھی ہوتی ہے۔"

"اسمیں شک نہیں کہ پھول کو کسی غازے کی ضرورت نہیں۔ اور چاند بن گہنے ہی خوبصورت نظر آتا ہے۔ پھر بھی تم میری خوشی کے لئے ان پوشاکوں اور گہنوں کو پہنا کرو۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر غم کے آرے چلنے لگتے ہیں۔"

"اچھا پہنا کرونگی۔" جمیلہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور دیکھو ہر وقت خوش رہا کرو۔ میں ہر وقت تمہیں خوش دیکھنا چاہتا اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتا۔"

پروفیسر مرزا نے وفور محبت سے جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے چوما۔

رفتہ رفتہ اٹھتے ہوئے دھندلکے ہر طرف چھا گئے تھے۔ آسمان میں بے شمار روشنیاں جھلملانے لگیں۔ خادمہ کمرے میں آئی۔

"کھانا تیار ہے۔" خادمہ نے کہا۔

"یہیں لے آؤ۔" پروفیسر مرزا نے کہا۔ "کھانا یہیں کھائینگے۔"

"بہت بہتر۔" خادمہ نے کہا۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"شیرن"، پروفیسر مرزا نے آواز دی۔ "ٹھہرنا"
"فرمایئے"، خادمہ نے انہیں قدموں پر رکتے ہوئے کہا۔
"کیا حکم ہے؟"
"بجلی کا بٹن دبا دو"، پروفیسر مرزا نے کہا۔ "بالکل اندھیر ہو گیا ہے"۔
خادمہ نے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔ خادمہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا جمیلہ کے سر کے بالوں کو لہرا رہی تھی۔ بالوں کی لٹیں رہ رہ کر اسکی گوری پیشانی پر بکھر جاتی تھیں۔ پروفیسر مرزا انہیں اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتا تھا۔ جسوقت اسکے ہاتھ جمیلہ کے بالوں کو چھوتے تو اسے یہی محسوس ہوتا۔ کہ اسکے دماغ میں سرور کیف کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی ہیں۔

"تمہاری اماں آئی تھیں؟"، پروفیسر مرزا نے مہر سکوت کو توڑا۔
"کیا کہتی تھیں؟ مجھ سے تو بولیں نہیں۔ شاید ناراض ہیں"۔
"باجی صفیہ کی چھوٹی لڑکی اصغری سخت بیمار ہے"۔
"کیا تکلیف ہے اسے؟"
"روز رات کو بخار آجاتا ہے۔ رہ رہ کر کھانستی ہے۔ ساری رات نہیں سوتی۔ چیختی ہے۔ روتی ہے"۔

ہے۔"

تو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا۔"

"ڈاکٹر حبیب اللہ کا علاج ہو رہا ہے۔"

"کیا لکھنو والے ڈاکٹر حبیب اللہ"؟

"جی ہاں۔ انہی کا۔"

"ڈاکٹر موصوف بچوں کے حق میں تو بہت اچھے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا۔ "بچوں کی بیماریوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ چند ہی دن میں اچھی ہو جائے گی اصغری۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"اب تک تو اسے آرام آگیا ہوتا۔" جمیلہ نے کہا۔

"لیکن باجی اسے بدپرہیزی سے نہیں روکتیں۔ انکا پیار نہ جانے کیا رنگ لائے گا۔ دوا تو جبھی اثر کرتی ہے۔ کہ اسکے ساتھ پرہیز بھی کیا جائے۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ مریض کے واسطے پرہیز سب سے بڑی دوا ہے۔ اسکے بڑے فائدے ہیں۔"

"جی ہاں، بہت۔"

"کل صبح جاکر اصغری کی خبر لے آنا۔" پروفیسر نے کہا۔

اور صفیہ سے کہنا جس چیز سے ڈاکٹر منع کرے۔ وہ چیز مریض کو ہرگز نہیں دیا کرتے۔ ذراسی لاپرواہی بعض اوقات مریض کے حق میں سخت خطرناک ثابت ہوا کرتی ہے۔"

"کل جاؤنگی تو باجی کی خوب ہی خبر لونگی" جمیلہ نے کہا "بہت لاپرواہ ہیں وہ"

خادمہ تولیہ۔ چلمچی اور آفتابہ اٹھائے ہوئے آگئی۔ پروفیسر مرزا اور جمیلہ نے ہاتھ دھوئے۔ اتنے میں دوسری خادمہ طشتری اٹھائے ہوئے آگئی۔ پہلی خادمہ نے میز اٹھا کر صوفے کے سامنے لگا دی۔ دوسری خادمہ نے اس پر رکابیاں قرینے سے چن دیں۔ قورمہ، پلاؤ، نرگسی کوفتے، چپاتیاں، چند ایک قسم کے مربے اور چٹنیاں اور فرنی۔ لذیذ وخوش ذائقہ کھانوں کی بھوک تیز کرنے والی خوشبو آہستہ آہستہ کمرے میں پھیلنے لگی۔ دوسری خادمہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ پہلی خادمہ ایک طرف فرش پر بیٹھ گئی جیب سے چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ اسے کھولا۔ اور نسوار کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈال لی۔ اور لبوں کو چوسنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد نسوار کا ہلکا ہلکا سرور آیا۔ کئی گھنٹوں تک متواتر کام کرتے رہنے سے جسم میں جو تھکاوٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ نسوار کے سرور سے جاتی رہی

تن بدن میں ایک نئی زندگی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر پروفیسر مرزا نے سگرٹ سلگایا۔ اور جمیلہ کو ساتھ لیکر کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ چاند دور درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ گہرے ارغوانی رنگ کی خلا میں ابھر رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے خوشبوؤں سے لبریز تھے۔ پروفیسر مرزا کے ساز دل کے ٹوٹے ہوئے تار ہلنے لگے۔

"کتنا دلکش سماں ہے" پروفیسر مرزا نے جمیلہ کو آغوش میں لیتے ہوئے کہا "چاند کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے"

جمیلہ خاموش رہی، جیسے منہ میں زبان ہی نہیں۔ پروفیسر مرزا نے جمیلہ کی پیشانی کو چوما۔ لیکن وہ ایک سانس لیتی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت اسکے سینے سے لگی رہی۔ پروفیسر مرزا کے سرد اور پھیکے ہونٹ اسکے جذبات کے سمندر میں تموج پیدا نہ کر سکے۔

*

(۳)

ہمیشہ کڑھتے اور جلتے رہنے کا نتیجہ دیوانگی ہے۔ جمیلہ کی رگ رگ میں جو شعلے سلگتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسے پاگل کر دیا۔ وہ رات بھر چلاتی رہتی تھی۔ زور زور سے چیخیں مارتی تھی۔ اور پھر خود سے باتیں کرنے لگتی۔ کبھی کبھی یونہی ہنس دیتی۔ اور پھر بالوں کو نوچنے لگتی۔ اور جب بال نوچتے نوچتے تھک جاتی۔ تو دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی۔ کچھ عرصہ تک تو اسکی یہی حالت رہی۔ اور پھر اسکے ساتھ ہی ایک اور روح فرسا چیز نمودار ہوئی۔ یعنی ہر وقت بخار رہنے لگا۔ پروفیسر مرزا کو سخت فکر لاحق ہوا۔ چند ایک سمجھدار یورپین لیڈی ڈاکٹروں کو دیکھایا۔ اور وہ سوائے اسکے اور کچھ تشخیص نہ کر سکیں کہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے۔ دماغ کو سخت صدمہ پہونچنے کی وجہ سے ہوش و حواس درست نہیں رہے اسکا علاج معالجہ کرنا سوائے روپے کی بربادی کے اور کچھ نتیجہ پیدا نہ کر سکے گا۔ لہذا اسے اسکی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن پروفیسر مرزا یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ کہ اسکی زندگی کی رونق یوں چیخے اور چلائے اور وہ اسے

اسکے حال پر چھوڑ کر اسکی وحشت و دیوانگی کا تماشہ کرے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ چاہے اسکی ساری دولت کیوں نہ لٹ جائے۔ وہ جمیلہ کے علاج و معالجہ میں ذرا دریغ نہ کرے گا۔ وہ اسے دنیا کے ہر خطے میں لیکر پھریگا اور اسکے درد کا درماں ہر قیمت پہ کرے گا۔ چند ایک دوستوں نے رائے دی۔ کہ اسے دہلی لے جاؤ۔ چند ایک نے جرمنی میں دو تین ڈاکٹروں کا پتہ بتایا۔ لہذا اس نے جمیلہ کو وہاں لیجانے کی مکمل تیاریاں کر لیں۔ لیکن اسی اثنا میں اسے اپنے ایک رشتہ دار نے مشورہ دیا۔ کہ جانے سے پہلے ڈاکٹر نجیب الدین سے جمیلہ کا معائنہ ضرور کروا لے۔ ڈاکٹر نجیب الدین نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ یورپ کے مختلف ملکوں میں گذرا تھا۔ اور ان ممالک کے شہرہ آفاق ڈاکٹروں سے اپنی قابلیت و ذہانت کا سکہ منوا یا تھا۔ اپنے عزیز کا مشورہ پروفیسر مرزا کے دل لگا۔ وہ اسے نجیب الدین کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر موصوف نے جمیلہ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ کہ اسے ہسٹریا ہو گیا ہے۔ جسکی وجہ آپکی عصبی کمزوری اور اسکا جوش شباب ہے۔ لیکن کوئی خاص خطرے کی بات نہیں۔ علاج کرنے سے سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ لہذا پروفیسر مرزا نے نہ صرف جمیلہ کا

*

اپنا علاج بھی ڈاکٹر موصوف سے کروانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب بیوی کے گرم خون کی حرارت کم کرنے کے لئے اسے ٹھنڈی دوائیں دینے لگے۔ اور شوہر کے سرد خون کی حرارت بڑھانے کے واسطے برق اثر طلے اور کشتے۔ پروفیسر مرزا کی ہوم لائبریری رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصا ہسپتال بنتی جا رہی تھی۔

"ایکسٹو دو" پروفیسر مرزا نے تھرمامیٹر کو بجلی کی روشنی میں بغور دیکھا۔ پڑھا۔ بخار بڑھ رہا ہے۔

جمیلہ نہیں دی۔ اسے اپنے بخار سے محبت تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ بخار اسقدر بڑھے کہ اسکی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اسکی حرارت سے خشک ہو جائے۔ کیسی ہلچل مچ جائے گی۔ جمیلہ نے سوچنا شروع کیا۔ کسی کو اپنے سر پیر کی خبر نہ ہوگی۔ سب کی آنکھوں میں آنسو ہونگے۔ سب میرے ہونٹوں کی جنبش پر نظریں جمائے بے چینی سے یہ سننے کے منتظر ہونگے کہ میں کیا کہتی ہوں۔ جمیلہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بجلی کے لمپ پر سرخ رنگ کا شیڈ چڑھا رہی تھی۔ لمپ کی مدھم سرخ روشنی نے کمرہ کی تاریک فضا میں پھیل کر عجیب منظر پیدا کر دیا تھا۔ جیسے شفق پھول رہی ہو۔ اجلی بجلی دیواریں۔ خوشنما ریشمی پردے فرنیچر سب کے سب ہلکے سرخ رنگ میں بڑے دلکش معلوم ہو رہے تھے۔

آج بھی جمیلہ کو بخار ہو ہی گیا۔ پروفیسر مرزا نے جمیلہ کی ماں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر تو کہتا تھا کہ اس مکسچر کے پینے سے بخار بالکل نہ ہوگا۔"

"اجی کوئی روگ ہو تو دوا اثر کرے۔" جمیلہ کی ماں نے کہا۔

"تو پھر کیا ہے اسے؟"

"اس کے سر پر کسی بھوت پریت کا سایہ ہے۔"

"بھوت پریت؟" پروفیسر مرزا نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں بھوت پریت۔ جبھی تو نہ دوا اثر کرتی ہے۔ نہ ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ آتا ہے۔"

"بھوت پریت خیالی وجود ہیں۔" پروفیسر مرزا نے کہا۔

"محض خیالی وجود۔ میں ان کا قائل نہیں۔"

"جی آپ کیوں ہونگے۔" جمیلہ کی ماں پاندان پر دھرپد نچاتے ہوئے بولی۔ "میری بچی کل مرتی آج مرجائے۔ آپ کی

بلا سے۔ آپکو کیا کمی ہے بیویوں کی۔ ایسی بیسیوں مل جائیں گی۔ لیکن لٹ تو میں جاؤنگی۔ آفت تو میری جان پر آئے گی"

"اتنی سمجھدار ہو کر جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہو"

پروفیسر مرزا نے کہا "جاہل اور ان پڑھ لوگ ایسی باتیں کیا کرتے ہیں۔ بھوت پریت کوئی چیز نہیں۔ ایسی بیہودہ باتیں نہ کیا کرو"

"جی میں کیسے مان لوں" جمیلہ کی ماں پان کی گلوری منہ میں ڈالتے ہوئے بولی "میں نے تو ان آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے"

"کیا دیکھا ہے تم نے؟"

جس مکان میں ہم پہلے رہتے تھے۔ وہاں اوپر والیوں کا بسرا ہے" جمیلہ کی ماں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ رات کو جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ تو مکان کے تہ خانے سے ڈھولک اور گھنگرو بجنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ جمیلہ کے ابا کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک جاگتے رہے۔ انکی پریشانی کی وجہ سے میں بھی نہ سو سکی۔ سو باقی رہی انکا۔ اور جب انکی آنکھ لگ گئی۔ تو کمر سیدھی کرنے کے لئے اپنی چارپائی پر آلیٹی۔ سونا چاہتی تھی لیکن نیند نہ آئی تھی۔ دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتی رہی۔ آخر جب نیند کسی طرح نہ آئی تو اُٹھ کر کوٹھے پر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ چاند نکل آیا تھا۔ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ نیچے صحن میں کھٹکا سا ہوا۔ میں نے منڈیر پر سے جھانک کر دیکھا۔ باورچی خانے کے دروازے میں دہلیز پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلائے یوں" اس نے انگلی کھڑی کر کے کہا، "الف سر کے بال۔ زمین پر سانپوں کی طرح لوٹ رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں ٹیڑھے اور ناخن تڑپ کے سے تیز و خونخوار۔ میرا تو کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ انہی قدموں پر پیچھے ہٹی پیچھے سے چارپائی پر آ پڑی۔ اور ساری رات پڑھتی پھونکتی رہی۔ صبح جمیلہ کے ابا جاگے تو سارا قصہ کہہ سنایا۔ وہ کہنے لگے۔ میں نے بھی ایک دن ایسی ہی شکل و صورت کی عورت باورچی خانے کے اندر گھستی دیکھی تھی۔ ہم نے اسی دن مکان بدل دیا۔ میرے خیال میں جمیلہ کو وہیں سے کچھ ہوا ہے بڑا بھاری مکان ہے۔"

"عقل سلیم ایسی باتوں کو نہیں مانتی" پروفیسر نے کہا۔

"انسان کے خیالات بعض اوقات عجیب و غریب شکلیں اختیار کر کے پرچھائیں کی طرح آنکھوں کے سامنے چلتے

پھرتے ہیں۔"

"آپکو کسی طرح یقین بھی آئے گا کہ نہیں؟"

"جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھونگا۔ کبھی یقین نہیں آسکتا۔"

"لیجئے ایک اور واقعہ سنائے دیتی ہوں۔" جمیلہ کی ماں نے کہا۔ "اب بھی اگر آپکو یقین نہ آئے۔ تو آسمان سے کوئی فرشتہ تو اسکی شہادت دینے کے لئے آئے گا نہیں۔"

"کیا ہے وہ واقعہ؟"

"جمیلہ کی خالہ شمیم اور اسکی تینوں لڑکیاں آخری چہار شنبہ کے روز قدسیہ باغ کی سیر کرنے گئیں۔ اور سیر کرتے کراتے تھک کر ایک پرانے برگد کے پیڑ تلے بیٹھ گئیں۔ ایکایکی اوپر شاخوں میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی بڑا سا پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا ہو۔ شمیم نے اوپر دیکھا۔ لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ سمجھی کوئی پرندہ تھا اڑ گیا۔ یہ اسی کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ٹوکری سے مٹھائی اٹھائی اور کھانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ شمیم کی نظریں خود بخود اوپر اٹھ گئیں۔ لیکن وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ شمیم بے میری طرح وہم کی پوٹ وہاں سے اٹھی اور لپ جھپ تانگے پر سوار ہو کر گھر آگئی۔ چراغ جلے ننھی ندرت کو بخار اس زور

سے چڑھا۔ کر ہنڈے سے گرمی کے بھبھاکے نکلنے لگے۔ ندرت کے ابا اسی وقت صوفی جی کو بلا لائے۔ سمجھدار تھے ایسے ویسے دماغ کے ہوتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ صوفی جی نے جھاڑا پھونکا۔ دم کیا پانی چھڑکا۔ فلیتے جلائے۔ تو کہیں ندرت کی آنکھیں کھلیں۔ اور بخار اترا۔"

"حیرت کی بات ہے" پروفیسر مرزا نے کہا "مجھے تو آج تک کبھی کوئی بھوت پریت نظر نہیں آیا۔ کبھی کسی بھوت پریت کی شکل نہیں دیکھی۔"

"کیا اتنا ہی شوق ہے بھوت پریت دیکھنے کا؟"

"ایک بات کی تحقیق جو کرنا ہوئی" پروفیسر مرزا نے کہا۔ "بنا دیکھے تو یقین آنے سے رہا۔ بات بنے تو کیسے بنے؟ مجھے تو یہ سب من گھڑت کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

"تو کیا بھوت دیکھنے ہیں؟"

"ضرور دیکھونگا۔"

"تو آج ہی دیکھ لیجئے۔"

"کیا جادو کے زور سے کسی بوتل میں بند کئے ہوئے ہیں تم نے؟"

جمیلہ کی ماں بولی "پرانے قبرستان کے پاس پیپل کے درختوں

کے جھنڈ ہیں۔ انہیں شاہ بڑے کے پیپل کہتے ہیں۔ پاس ہی ایک پرانا کنواں ہے۔ شاہجہاں بادشاہ کے وقت کا ہے۔ اسمیں بھوت رہتے ہیں۔ چراغ جلے وہ کنویں سے باہر نکل کر وہاں ناچتے کودتے پھرتے ہیں آج وہاں جا بیٹھے۔ قائل ہو جائیں گے آپ "

" یہ سب یار لوگوں کی نشے کی ترنگ میں تراشی ہوئی کہانیاں ہیں بے سرو پا۔ لغو۔ خدا کیلئے مغز نہ چاٹو "

" آپ میری بات نہ مانینگے۔ جمیلہ کے ابا کو بھیجونگی آپکے پاس۔ وہی آپکو سمجھائینگے "

" اگر بھوت پریت کی کہانیاں سنانے کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ تو ان سے کہدینا کہ آنے کی تکلیف نہ فرمائیں۔ اور اگر ملنے کے لئے آئیں تو دیدہ دل فرش راہ۔ انکا اپنا گھر ہے۔ ہر وقت دروازے کھلے ہیں۔ انکے آنے سے ہمیں راحت ہوگی "

" خیر جی آپ قائل ہوں یا نہوں " جمیلہ کی ماں نے کہا " میں تو پوری طرح قائل ہوں۔ کل ضرور جمیلہ کو پیر صاحب کے قدموں میں لے جاؤنگی۔ جبھی اسکی جان بچے گی۔ یہ دوائیاں کچھ نہ کر سکیں گی "

" پیر صاحب کون ؟ " پروفیسر مرزا نے پوچھا۔

" پیر ملکوتی "

عجیب نام ہے۔

"جی ہاں۔ ولی اللہ ہیں۔ صاحب کرامات ہیں۔ ہاتھ پہ سرسوں اگاتے ہیں۔"

"لو اب نئی سوجھی۔ نیا شگوفہ چھوڑا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ پیر پرست کب سے بنی ہو؟"

"میں تو ہمیشہ سے پیر فقیر کی طالب ہوں۔" جمیلہ کی ماں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ پیر فقیر کی ذات سے بھی منکر ہیں۔"

"میرے لئے میرا خدا ہی کافی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"میں صرف اسکا طالب ہوں۔ صرف اس سے مانگتا ہوں یہ پیر فقیر کیا دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ہماری طرح مجبور و لاچار انسان ہیں۔"

"توبہ، توبہ۔ یہ کفر ہے۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالئے۔ وہ کونسی چیز ہے۔ جو ان سے نہیں ملتی۔ ہماری ہر حاجت کو رفع کرتے ہیں۔ منہ مانگی مراد دیتے ہیں۔ کوئی عقیدت سے مانگ کر دیکھے۔"

"دیکھو بڑی بی میں تم سے کہے دیتا ہوں۔ تم جہاں جی

چاہے جوتے چٹخاتی پھرو۔ لیکن اگر جمیلہ کو کسی ایسی ویسی جگہ پر ساتھ لے گئیں۔ تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ میں ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ میری بیوی تکیوں اور چنڈو خانوں میں بھٹکتی پھرے۔ جہاں اخلاق سے گرے ہوئے لوگ رہتے ہیں۔"

پروفیسر مرزا نے تیز و تند لہجہ میں کہا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

---

(۴)

پروفیسر مرزا کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ جمیلہ کو پیر صاحب کے پاس لیجانے کے لئے بلایا گیا ہے۔ تو وہ کبھی بھی اسے نہ بھیجتا۔ اور نہ جانے کیا کرتا۔ لیکن اسے چونکہ یہ بتایا گیا تھا۔ کہ جمیلہ کی بڑی بہن صفیہ بیمار ہے۔ اسلئے اس نے جمیلہ کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ اور جاتے وقت اسے یہ بھی کہا۔ کہ اگر میری ضرورت

ہو تو مجھے بلوا لینا۔"

جمیلہ کی ماں کا پیر ملکوتی پر بڑا اعتقاد تھا۔ وہ اسے بڑا صاحب کرامات سمجھتی تھی۔ اور بظاہر پیر صاحب واقعی فرشتہ نظر آتے تھے لیکن بباطن شیطان تھے۔ ان کے جسم میں دنیا بھر کی عفونتیں اور غلاظتیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن لوگ اسکے پر نور چہرے، ماتھے کے محراب، جبے اور عمامے کو دیکھ کر کچھ ایسے قائل ہوتے کہ اسے فرشتوں سے بھی اوپر سمجھنے لگتے۔ واقعی عقیدہ ایک طلسم ہے۔ جس میں پھنس کر انسان مشکل ہی سے باہر نکلتا ہے۔

پیر صاحب کے حجرے کا دروازہ بند تھا۔ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر چنگیروں میں پھول بھرے رکھے تھے۔ جن سے بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ عنبریں اگر بتیاں اور لوبان سلگ رہا تھا جسکا دھواں عود دان سے نکل کر پیچ و خم کھاتا ہوا حجرے کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے روزنوں کی طرف سانپ کی طرح رینگ رہا تھا جن میں چمگادڑوں اور ابابیلوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ پھولوں کی چنگیروں کے درمیان میں شمع دان رکھا تھا۔ جس میں پگھلی ہوئی شمع جھلملا رہی تھی۔ اور پاس ہی دودھ سے بھری ہوئی صراحی اور کوزہ رکھا تھا۔ جمیلہ شبنمی ململ کے دوپٹے کے آنچل

.... میں چہرہ چھپائے بت بنی بیٹھی تھی۔ پیر صاحب اسکی بائیں طرف گاؤ تکیئے سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور منہ میں ہولے ہولے کچھ پڑھ رہے تھے۔ یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی فرشتہ جنت کی تمام روشنیوں اور پاکیزگیوں کو ساتھ لیکر دنیا سے ذلت وظلمت دُور کرنے کے لئے زمین پر اتر آیا ہے۔

پیر صاحب نے (غول) بیابانی کی سی سرخ آنکھیں کھولیں۔ جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مسکرا دیئے۔ ہاتھ بڑھا کر صراحی اور کوزہ اٹھا لیا۔ دودھ کوزے میں ڈالا۔ اور اسپر کچھ پڑھکر پھونکا۔ پھر جمیلہ کی طرف دیکھا۔ مسکرا دیئے۔ اور کوزہ اسکی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"اسے پی لو۔ اور ان مقدس روشنیوں سے ایک درجہ اور قریب ہو جاؤ۔ جو ہمارے جسم مطہر سے پھوٹ رہی ہیں"

پیر صاحب کی آواز نے جمیلہ کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ چونک پڑی۔ پیر صاحب کے جسم مطہر سے پھوٹتی ہوئی روشنیوں سے ایک درجہ اور قریب ہو جائے گی وہ۔ خدا جانے وہ کیسی روشنیاں ہونگیں؟

کیا اسکا جسم ان پاکیزہ روشنیوں کا متحمل ہو سکے گا؟

جمیلہ نے ہاتھ بڑھا کر کوزہ پکڑ لیا۔ اسکی لانبی لانبی نرم ونازک

انگلیاں پیر صاحب کی انگلیوں سے ٹکرائیں۔ پیر صاحب نے ایک جھرجھری لی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ پیر صاحب کے لب پھر آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ جمیلہ نے دھیرے دھیرے دوپٹے کا آنچل ایک طرف سرکایا اور کنکھیوں سے پیر صاحب کی طرف دیکھا۔ بھوری سی لٹیں شانوں سے نیچے تک لٹکتی ہوئیں۔ ماتھے پہ محراب۔ چہرہ چاند کی طرح نورانی داڑھی سینے کو چھوتی ہوئی۔ سبز رنگ کا ریشمی لبادہ گھٹنوں تک پھیلا ہوا۔ اور اسکے نیچے اسی رنگ کا ریشمی تہبند۔ جمیلہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ کہ اگر اس فرشتہ صورت بزرگ نے اس سے یہ پوچھ لیا۔ کہ اسے اپنے شوہر میاں سے نفرت کیوں ہے تو وہ کیا جواب دے گی؟ کیا وہ اسے صاف صاف کہہ دے گی۔ کہ اسکا شوہر بوڑھا ہے اسلیئے وہ اسے نفرت کرتی ہے؟ مختلف قسم کے خیالات میں گھری تھی کہ جمیلہ نے کوزہ لبوں سے لگا لیا۔ دودھ اسکے گلے کی نیلی نیلی رگوں میں اترتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ پیر صاحب دائیں آنکھ کے کونے سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

جیسے ہی کوزہ [illegible] خالی ہوا [illegible] کی [illegible] میں دھیمی [illegible] سنکھ کی بول لیوں خاموش فضا میں گونجی۔ اور اسکے ساتھ ہی پیر صاحب کے

چیلے چانٹوں کی بے ہنگم آوازیں۔ جو بلند ہو ہو کر آہستہ آہستہ خاموش ہوتی گئیں۔

دودھ کو حلق سے نیچے اترے ابھی چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ جمیلہ کو دفعتہً ایک پھریری سی آئی۔ جیسے ہوا کا معطر جھونکا اسے زمین سے کھلی فضا میں لے اڑا۔ اور پھر آہستہ آہستہ پھریری پر پھریری آنے لگی۔ ہلکی ہلکی، میٹھی میٹھی۔ نیند کی شیرینی میں گھلی ملی آسمان کی سنہری روشنیاں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ وہ سرور و کیف کی ہلکی لہروں پر تیرتی چلی جا رہی تھی۔ خوشبوؤں روشنیوں اور رسیلی آوازوں کے درمیان وہ ناچتی ہوئی لہروں پر تیرتی چلی جا رہی تھی۔ نیند کی حسین پری کے نرم و نازک ہاتھوں نے اسکے جھکے ہوئے پپوٹوں کو گدگدانا شروع کیا۔

پیر صاحب نے بھوکے چیتے کی طرح غراتے ہوئے آنکھیں کھولیں تکیئے پھلا کر دو تین پھنکاریں ماریں۔ اور کمرے کی چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ اور عرصہ تک ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ شمع جل کر بالکل تھوڑی سی باقی رہ گئی تھی۔ نحیف و کمزور شعلہ لرزتے ہوئے آخری سانس لے رہا تھا۔

پیر صاحب پھر غرائے۔ شمع کا شعلہ لرزا۔ پیر صاحب کھسک کر جمیلہ کے اور قریب ہو گئے۔ اور اپنی خشمناک نظریں جمیلہ پر گاڑ دیں۔ جیسے زہریلا سانپ ننھی منی چڑیا پر دہشت طاری کرنے کے لئے اس پر اپنی نظریں گاڑ دیتا ہے جمیلہ دوپٹے کے آنچل سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی لہریں۔ خوشبوئیں۔ روشنیاں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت کہاں ہے۔

شمع کا شعلہ لرزا۔ مدھم پڑ گیا۔ پھر ذرا کپکپانے لگا۔ ہولے ہولے نیچے بیٹھتا گیا۔ پھر لہراتے ہوئے اٹھا۔ تھر تھرانے لگا۔ تھرکتا رہا۔ اور پھر تھرتھراتے تھرکتے پھک سے بجھ گیا۔ جمیلہ نے آنچل کو ایک طرف سرکایا۔ حجرہ بالکل تاریک ہو گیا تھا صرف بجھی ہوئی شمع کے گل سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی سرخ لو اندھیرے پر غالب آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر اسے یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے لمبے لمبے سانپ رینگ رہے ہیں۔ اور منہ کھول کھول کر اسکی طرف لپکتے ہیں جمیلہ کو دائیں بازو پر کوئی نرم سی چیز رینگتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ اس طرح کانپنے لگی جسطرح بھونچال کے آنے سے دھرتی کا ذرہ ذرہ کانپنے لگتا ہے۔ اسکا ماتھا پسینہ سے بھیگ گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔

رینگتے رینگتے وہ نرم سی چیز جمیلہ کے ہاتھ تک پہونچی تو اسے

معلوم ہوا کہ پیر صاحب کا ہاتھ ہے۔ جو نہ جانے کیا تلاش کر رہا ہے؟ کس جستجو میں ہے؟ جمیلہ نے بازو کو زور سے جھٹکا دیا۔ پیر صاحب کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اسکے دل میں پیر صاحب کے متعلق بدگمانی بڑھ رہی تھی۔ یہ داڑھی، یہ عمامہ، یہ جبہ اور یہ کرتوت۔ شکل و صورت سے فرشتہ اور دل میں شیطان۔ کامل سکوت کے چند لمحے گذر جانے کے بعد جمیلہ نے محسوس کیا۔ کہ پیر صاحب کا ہاتھ اسکے دائیں زانو پر سرسرا رہا ہے۔ جمیلہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ پیر صاحب بھی سائے کی طرح اسکے ساتھ اٹھے۔ اور باز کی طرح جھپٹے۔ جمیلہ پیچھے ہٹ گئی۔ پیر صاحب اور آگے بڑھے اس سے پہلے کہ وہ چیخے کے لئے منہ کھولتا۔ پیر صاحب نے اسکے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خاموش" کتنی خوفناک آواز تھی۔ لیکن جمیلہ نے حوصلہ نہ ہارا۔ پیر صاحب کے ہاتھ پہ زور سے کاٹا پیر صاحب تلملا اٹھے۔ اور ہاتھ دبانے لگے۔ جمیلہ نے اس زور سے چیخنا چاہا۔ کہ اسکی آواز حجرے کی دیواروں کو چیرتی ہوئی دنیا کے دوسرے سرے تک سنائی دے۔ لیکن گلہ اس رومال میں ملی ہوئی نشیلی بوٹی کی وجہ سے اسقدر خشک ہو گیا تھا کہ اس سے بولا ہی نہ گیا۔ پیر صاحب نے پھر جرأت کی۔ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھے۔

جمیلہ کا خوف و دہشت سے یہ عالم ہو گیا تھا۔ کہ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ پنڈلیاں کانپ رہی تھیں۔ دانت کٹکٹا رہے تھے۔ حجرے کے دروازے کی طرف بھاگی۔ بے تحاشا۔ بدحواس ہو کر۔ دروازے کے قریب پہونچکر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ قدموں کی آہٹ۔ اور قریب۔ اور قریب۔ وہ آرہا تھا۔ وہ آرہا پھرا ہوا بھیڑیا۔ زہریلا سانپ۔ پھنکارتا ہوا اسکی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اب وہ بھاگ بھی نہ سکتی تھی۔ اسے مرنا ہی ہو گا۔ زندگی عصمت سے زیادہ قیمتی شئے نہیں۔ موت کے خیال نے اسے آہنی عزم دے دیا۔ وہ آگے بڑھی۔ اس بھوت کے مضبوط ہاتھوں نے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔ اسکی کلائی معلوم ہوتا تھا۔ کسی آہنی شکنجے میں جکڑی گئی ہے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ یہ جب تک ٹوٹ کر شانے سے لٹک نہیں جاتی۔ جمیلہ اسے چھوڑانے کی کوشش کرے گی۔ اسے حرکت دے گی۔ دونوں میں ریل پیل شروع ہو گئی پرندے پھر پھراتے ہوئے گھونسلوں سے اڑنے لگے۔ پیر صاحب کے حجرے سے بلند ہوتی ہوئیں سڑپڑ کی آوازیں ساتھ والے حجرے میں جمیلہ کی ماں اور اسکی بڑی بہن کے کانوں تک بھی پہونچیں۔ خوش ہو رہی تھیں کہ پیر صاحب

بہت سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ ابھی پچھاڑا کہ پچھاڑا۔

کافی دیر تک دونوں میں ریل پیل جاری رہی۔ آخر پیر صاحب ہانپنے لگے۔ جمیلہ ایسی نازک اندام ہرنی میں شیر کی سی طاقت نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ وہ خود حیران تھی۔

آخر جب کوئی چارہ نہ چلا۔ تو پیر صاحب نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ یعنی کمر سے لپٹ گئے۔ اور اسے زمین پر گرانے کی کوشش کرنے لگے۔ جمیلہ نے پورے زور سے پیر صاحب کی ناک پر گھونسا جمایا جو کہ عین بانسے پر ہتھوڑے کی طرح لگا۔ پیر صاحب کی آنکھوں کے سامنے تارے گھومنے لگے۔ گھوپری سے چنگاریاں پھوٹ نکلیں۔ چودھاں طبق روشن نظر آنے لگے۔ ہاتھ خود بخود کمر سے علیحدہ ہو گئے۔ بکرے کی طرح بغبغاتے ہوئے ناک پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جمیلہ نے دانت پیستے ہوئے ایک اور گھونسا رسید کیا۔ یہ پیر صاحب کی کنپٹی پر بم کی طرح پھٹا۔ تلملاتے ہوئے طیش میں اٹھے۔ اور ابھی اٹھ ہی رہے تھے۔ کہ جمیلہ نے کمرے پر لات جمائی۔ دھم سے چاروں شانے چت زمین پر جا پڑے۔ اور ابھی انکا سینہ زمین سے ایک انچ ہی اوپر اٹھا تھا۔ کہ اوپر سے دوسری لات پڑی۔ جہاں تھے وہیں پڑے رہے۔ اور کیچڑ میں دھنسے ہوئے کیکڑے کی طرح ہاتھ

پاؤں مارنے لگے۔ ابکے دانتوں کو سخت چوٹ آئی۔ نچلا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ خون بہنے لگا جسم میں اتنی طاقت بھی باقی نہ رہی کہ اٹھ سکیں۔ جمیلہ لات تانے منتظر تھی کہ اٹھ تو سہی۔ دیکھ تیرا کیا حشر کرتی ہوں۔ اس دفعہ زمین میں نہ دھنسا دیا تو کہنا۔ دھرتی کے سینے پر چلتی پھرتی لعنت گندگی کے سینے پر رینگنے والے نجس و ناپاک کیڑے۔ دوزخی کتے۔ پاجی۔ تیری یہی سزا ہے۔ مزا مل گیا نا ایک شریف عورت پر ہاتھ ڈالنے کا۔ تو نے سب کو ایک سا ہی سمجھ رکھا ہے۔ شیطان۔ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔

پیر صاحب کو یہی معلوم ہو رہا تھا کہ کمر ساتھ نہیں ہے۔ جمیلہ کی دو ہی لاتوں نے اسے شل کر دیا تھا۔ کنویں میں گرے ہوئے مینڈک کی طرح سوچ رہے تھے۔ کہ کس آفت میں پھنس گئے۔ یہ کیا مصیبت مول لے لی توبہ عورت ہے کہ جن جسم پریوں کا سا لیکن دل جنوں کا۔ جنگلی سانڈ میں بھی اتنا زور نہیں ہوتا۔ نزدیک نہیں آنے دیتی۔ ایسی عورت آج تک نہ دیکھی تھی سان نازک نازک ہاتھوں میں نہ جانے کیا بجلی بھری ہے جہاں پڑتے ہیں گوشت کو برف کر دیتے ہیں۔ خون جم جاتا ہے۔ یہ کیا غلطی کر بیٹھے؟ اب کیا کیا جائے؟ اس پر قابو پانا تو بس کا روگ نہیں۔ اگر آپکے آگے بڑھے تو جان سے مار دے گی۔ اور دوسری طرف عزت و عظمت

سخت خطرے میں ہے۔ بنی بنائی خاک میں مل جائے گی۔ سارا بھرم کھل جائے گا۔ دو کوڑی کے نہ رہینگے۔ اور یہ جو کچھ کہے گی اسکی شہادت یہ ہلتے ہوئے دانت اور کٹا ہوا ہونٹ دے گا۔ اسے جھٹلایا بھی تو نہیں جاسکتا یہ بینی شاہد موجود ہیں۔ کس مصیبت میں جان ہے تو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اتنی سخت نکلے گی۔ اس حجرے کے اندر داخل ہوتے ہی بڑے بڑے مضبوط دل کانپنے لگتے ہیں۔ کوئی زور سے سانس نہیں لے سکتا۔ دم بخود ہو جاتے ہیں۔ نبض کی جنبش میں فرق آجاتا ہے۔ آنکھ جھپکنے کی جرأت نہیں ہوتی اس حجرے کی اتنی ہیبت ہے۔ لیکن اسکا دل نہ جانے کس فولاد کا بنا ہوا ہے جس سے آنکھیں ملاتے تھے مسحور کر لیتے تھے۔ یہ سرخ آنکھیں کتنی ڈراونی اور بھیانک ہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے انہیں دیکھکر۔ اور آج تو انہیں اور بھی زیادہ خوفناک بنایا گیا تھا۔ بھنگ پی۔ گانجا پیا۔ اور سلفا اور چنڈو بھی۔ اتنا نشہ تھا کہ دن کو ہی رات پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سنسان و ہولناک قبرستان کا سا خوف تھا ان آنکھوں میں بھرا ہوا۔ لیکن اسکا دل نہ خائف ہوا۔ مدعا بھی پورا ہوا اور آبرو بھی کھودی۔ اب صرف ایک راستہ باقی تھا۔ صرف ایک راستہ۔ اس سے معافی مانگی جائے۔ التجاؤں اور منتوں سے اسکی زبان کو خاموش کیا جائے۔

پیر صاحب زخمی کتے کی طرح رینگتے ہوئے جمیلہ کے قدموں

تک پہونچے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بے اختیار مسکرا رہی تھی۔ بڑے موذی کو مارا۔ شاباش ہے تجھے۔ آفرین ہے۔ بڑی ہمت کی۔

مرحبا۔ کوئی اندرونی طاقت جمیلہ کو شاباشی دے رہی تھی۔ سانپ کا سر کچلا ہے تو نے۔ اس نے بے شمار معصوم روحوں کو ڈسا۔ باولے بھڑیئے کے دانت توڑے ہیں تو نے۔ بنکے خونخوار دانتوں نے نہ معلوم کتنے نازک جسموں کو زخمی کیا۔

"بیٹی مجھے معاف کردو۔" پیر صاحب نے جمیلہ کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کردو بیٹی۔"

"مجھے بیٹی کہتے ہوئے تجھے شرم تو نہ آتی ہوگی مردود۔ جمیلہ تند لہجہ سے بولی۔ "مجھے کس منہ سے بیٹی کہہ رہے ہو؟"

"وہ میری بھول تھی۔ مجھے معاف کردو بیٹی۔ تم میری بیٹی ہو۔"

"بیٹی۔ تف ہے تجھ پر۔" جمیلہ نے پیر صاحب کا سر ٹھکراتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی چارہ نہ چلا تو بیٹی کہنے لگے۔"

"غلطی کرنا انسان کا خاصہ ہے۔ غلطی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ انسان غلطیوں کا پتلا ہے بیٹی۔"

"جب زندگی غلطیوں کا طومار ہو تو زندہ رہنا بھی غلطی ہے جا کسی کنویں میں گر جا۔ زہر کھالے۔ اس حجرے کو آگ لگا کر

یہیں بھسم ہو جا۔ کسی بدن میں ڈوب مر۔ اب اگر زندہ رہے گا تو بڑی غلطی کرے گا۔ تیری اس غلطی کا کفارہ موت ہے۔"

"خودکشی کرنا حرام ہے بیٹی۔ ورنہ میں تو کبھی زندہ نہ رہتا۔ سخت نادم ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ خودکشی کرنے والے کو نجات نہیں ملتی۔"

"تو کیا تجھے امید ہے کہ کبھی نجات مل سکے گی تیری گناہ گار روح کو؟" جمیلہ نے کہا۔ "میرے خیال میں تو تو ہمیشہ جہنم کے شعلوں میں گھرا رہے گا۔ سانپ اور بچھو تیرے جسم کو کاٹ کاٹ کر کھائینگے۔ تو پیپ اور خون پیتا رہے گا تجھے کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ تیرے لئے بخشش کے دروازے بند ہیں۔ نجات کا خیال دل سے مٹا دے۔"

"مجھے زیادہ شرمندہ نہ کر دو بیٹی۔ معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔" پیر صاحب جمیلہ کے قدموں پر سر رگڑ رہے تھے۔

"میں تجھے کبھی معاف نہ کرونگی۔" جمیلہ نے پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کبھی معاف نہ کرونگی۔ تجھے اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ دیکھ تو سہی تیرا کیا حشر کرتی ہوں۔"

"بیٹی۔"

"بکواس۔" جمیلہ نے اسکی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "صبح ہوتے ہی لوگوں کا ہجوم تیرے پیچھے ہوگا۔ جو تجھے پتھراؤ کر رہا ہوگا۔ اور تو بادلے

کتے کی طرح جان بچانے کے لئے بے تحاشا آگے آگے بھاگ رہا ہوگا۔
تیرا یہ نجس و ناپاک جسم جو ہر وقت پھولوں پر آرام کرتا ہے۔ جس پہ خوشبوئیں چھڑکی جاتی ہیں۔ جس پر کشتوری اور کیسر کا لیپ کیا جاتا ہے۔ عفونتوں اور بدبوؤں میں دھنسا ہوا ہوگا۔"

"اس داڑھی کی شرم رکھ لو بیٹی۔ اس محراب کا خیال کرو۔"

"تیری شرم رکھ لوں۔ جسے دوسروں کی شرم کا کچھ خیال نہیں جو معصوم عورتوں کی عزت و عصمت پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ ایک طرف ہٹا اپنے مکروہ ہاتھوں کو۔ مجھے جانے دے۔"

"خدا کے لئے ٹھہرو۔" پیر صاحب نے التجا کی۔ "اگر انسان سچے دل سے توبہ کرے تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔"

پیر صاحب نے جمیلہ کے قدموں میں سر اگرا اور آنسو بہانے لگے۔

"تیرے آنسوؤں سے مکر و فریب کی بو آتی ہے۔ تیرے آنسو مگرمچھ کے آنسو ہیں۔ میرے پاؤں کو ناپاک نہ کر ان سے۔"

"معاف کر دو بیٹی۔ مجھے معاف کر دو۔"

"یہ داڑھی۔ یہ محراب۔ یہ لٹیں۔ یہ چونہ۔ اور یہ کرتوت۔ ملعون

پاکھنڈی :۔

"میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں بیٹی۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ تو نے مجھے ذلت وظلمت کے گڑھے سے باہر نکالا ہے۔ اندھیرے میں بھٹک رہا تھا۔ تو نے مجھے روشنی دکھائی ہے۔ میں جو کچھ تھا اب نہیں ہوں"

"کیا بھیڑیا اپنی سرشت کو بدل سکتا ہے؟"

"ہاں بدل سکتا ہے۔ اگر نیکی کی روشنی اسکے دل میں پیدا ہو جائے"

"تیرے دل میں نیکی کی روشنی پیدا نہ ہو سکے گی۔ تاریکی سے روشنی کو ہمیشہ سے نفرت ہے۔ وہ کبھی تاریکی کے قریب نہیں آتی۔

"اسے آنا چاہئے۔ تاکہ تاریکی تاریکی نہ رہے۔ تاریکی کو دور کرنا روشنی کا سب سے بڑا مقصد ہے"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم سچے دل سے توبہ کرتے ہو؟"

پیر صاحب کی جان میں جان آئی۔ بولے۔

"ہاں میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔ خدا شاہد ہے"

"کیا سچ ہے کہ تم گناہوں سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ سچ ہے"

"نہیں مجھے یقین نہیں آتا"

"تمہیں کیسے یقین آسکتا ہے؟"

"اچھا تو قسم کھاؤ"

پیر صاحب نے سجدہ کرتے ہوئے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی ایسی ناپاک حرکت نہ کرینگے۔ اور جمیلہ نے معاف کر دیا۔ حجرے کا دروازہ کھلا۔ اور جمیلہ دانت پیستے ہوئے باہر نکلی۔ اسے اپنی ماں پر سخت غصہ آرہا تھا کہ نہ جانے اسکے دماغ میں یہ کیا جنون سمایا ہے کہ مجھے بھوت نے دبوچ رکھا ہے۔ کوئی جن عاشق ہو گیا ہے۔ کسی بدروح کی طبیعت آگئی ہے۔ اور پرالی کے کلیجہ پکڑ رکھا ہے۔ لیکن اصل بات کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مرض معلوم نہیں کرتی اور دعائیں ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ کتنی بیوقوف ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے جو بھوت چمٹا دیا ہے۔ اسکا اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ اور آئے بھی کیسے۔ اسکی دولت نے آنکھوں پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ایسے ماں باپ بھی کسی کام کے نہیں جو بیٹی کو فروخت کر دیتے ہیں۔ دولت کو پوجتے ہیں۔ اپنے خون

اپنے گوشت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اگر نصیحت زدہ بیٹی منہ کھولے۔ زیادہ کرے۔ تو بے شرم۔ بے حیا۔ گستاخ۔ شوخ دیدہ۔ بدکار۔ فتنہ۔ آوارہ اور نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں۔ بیٹی کھائے تو اپنی مرضی کی چیز کھائے پہنے تو مرضی کا پہنے۔ اور جب خاوند کا سوال پیدا ہو تو اسکی مرضی کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں ماں باپ کی مرضی۔ عجیب بات ہے۔ جسکے ساتھ عمر گزارنی ہے۔ جو روح کی غذا ہے۔ جو زندگی کا زیور ہے۔ اسے ماں باپ پسند کرتے ہیں۔ وہاں لڑکی کا بولنا اسکے بے شرم ہونے کی دلیل۔ بیٹی کی زندگی رستا ہوا ناسور بنتی ہے تو بن جائے۔ لیکن ماں باپ کی مرضی مرضی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ بیٹی کو ہر حالت میں ان کی مرضی کو ماننا پڑے گا۔ اسکی مرضی ماں باپ کی مرضی ہے۔ اور ماں باپ کی مرضی اسکی مرضی۔ اسے سرجھکانا پڑے گا۔ نیک بخت، شریف بیٹیاں بولا نہیں کرتیں۔ ماں باپ اگر ذاتی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں کسی گنجے کانے یا بوڑھے کھوسٹ کے سپرد کردیں۔ تو انہیں صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے۔ وہ شادی کی بکل مار چپ کرکے ڈولی میں سوار ہو جانا چاہئے۔ اسے شادی کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرنا چاہئے۔ کہ شادی کسے کہتے ہیں؟ ہمارے ملک میں شادی کو بالکل لاٹری بنا دیا گیا ہے۔

قسمت اچھی ہو تو موتی نہیں تو پتھر۔ بیٹی ساری رات شیطان سے لڑتی رہی۔ اپنی عصمت کی حفاظت میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ اور ماں سمجھتی رہی بھوت نکل رہا ہے۔ کوئی ہے جو ان بپھرے ہوئے دماغوں کو درست کرے؟ ان بگڑی ہوئی عقلوں کو ٹھکانے پر لائے؟

---

(۵)

جمیلہ کا کمرہ کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف تھا۔ کمرے کے تمام دروازوں پر نیلے رنگ کے ہلکے پھلکے ریشمی پردے لٹکائے گئے تھے۔ کمرے کی چھت سے برقی فانوس لٹکا ہوا تھا۔ آرٹ کا ایک نادر نمونہ تھی۔ جب فانوس روشن ہوتا تو تمام چھت پر چھوٹے چھوٹے ستارے جھلملانے لگتے۔ اور سارے کمرے میں ایک ہلکی سی نیلی نیلی روشنی پھیل جاتی۔ کمرے کی دیواریں گوناگوں رنگوں کی تصویروں سے سجی ہوئی تھیں۔ آرٹ کے بہترین نمونے بڑے بڑے سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے تھے۔

ایک تصویر میں ایک دوشیزہ ایک رنگین تتلی کے پیچھے بھاگتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ ایک دوسری ہاتھی دانت سے ترشے ہوئے چوکھٹے کی

تصویر میں ایک اٹھارہ سالہ جوان لڑکی سلمہ کی ہوئی سرخ رنگ کی ساری میں ملبوس انگڑائی کے انداز میں کھڑی تھی۔ سفید مرمری باہوں کا خم دھنک کی قوس سے کہیں زیادہ دلفریب تھا۔ یہ ایک اطالوی مصور کا شاہکار تھی۔

جمیلہ نے اسدن ملک کے ایک شہرۂ آفاق ادیب کا ناول زناروں کی چھاؤں میں ختم کیا تھا۔ جسکے غم انگیز اثرات سے اسکی طبیعت پر ایک گونہ اداسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اٹھی اور شفق کی ہلکی سی روشنی میں دریچے تک گئی۔ اور پردہ ایک طرف سرکا کر پٹ کھول دیئے کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہکنے لگا۔ جمیلہ دریچے کے اس حصے کے قریب جہاں مولسری کے پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں کھڑکی کے دھندلے شیشوں سے ٹکرا کر ایک مبہم سی موسیقی پیدا کر رہی تھیں، کھڑی ہو کر سوچنے لگی۔ کہ ملک کے اس بے مثل ادیب کا یہ غیر فانی شاہکار ضرور اسوقت کی یادگار ہو گا۔ جب کے اندھے کیوپڈ کے تیروں سے مجروح ہو کر اسکی جوانی حسرت و یاس کے دھارے میں بہہ رہی ہو گی۔

اور محبت کی ناکامیوں اور زندگی کی فریب کاریوں سے تنگ آکر وہ غم کے سینے پہ دم توڑنے کو مجبور ہو گیا ہو گا۔ کتنی غم انگیز داستان ہے۔ کتنی پُر درد کہانی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسکا ایک ایک فقرہ ایک ایک جملہ آنسوؤں اور آہوں سے لکھا گیا ہے۔ تخیلات سے تو ادر دل

بیٹھا جاتا ہے۔

جمیلہ نے ایک دبا ہوا سانس لیا۔ اور دل بہلانے کی خاطر ٹہلنے لگی۔ کہ اچانک اسے اس البم کا خیال آیا۔ جو کہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ اسکے سینے میں ہلکی ہلکی چاندنی پھیلنے لگی۔ وہ کتابوں کی الماری کی طرف بڑھی اور طبیعت کی شگفتگی کو جو ایک نوجوان کی تصویر کو دیکھ کر اسکے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ برقرار رکھنے کے لئے وہ کتاب نکال لی۔ اور کرسی کھڑی کے پاس کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"محبت ایک سراب اور آرٹ ایک جنوں ہے"

یہ عبارت سنہری حروف میں مرقع کے پہلے صفحہ پر لکھی ہوئی تھی۔

"محبت ایک سراب اور آرٹ ایک جنون ہے۔ جمیلہ کافی دیر تک اس عبارت پر غور کرتی رہی۔ اور پھر ورق الٹنے لگی۔

آج جمیلہ کو اس تصویر کے دیکھنے میں بھی کوئی خاص لطف نہیں آرہا تھا۔ بیقراری میں وہاں سے اٹھی۔ اور باہر باغیچے میں نکل آئی۔

چودھویں رات کا چاند کدا کے پیڑ کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا نوشگفتہ کونپلیں اسکی کرنوں کے لمس سے چمک اٹھی تھیں۔ جمیلہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کوٹھی کے پورچ پر پھیلی ہوئی سیوتی کی بیل کے پاس جا پہونچی۔ بیل کے پاس ہی ایک طرف گل مورکا پرانا درخت تنا کھڑا تھا۔ جسکی شاخوں کے سروں پر پتوں اور پھولوں کے گچھے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ بہار کی پریاں چاندنی میں نہاتے ہوئے اپنے رسیلے ساز بجا رہی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک وہ سب اندر کمرے میں سوتے تھے۔ لیکن آمدِ بہار کے باعث سردی زیادہ نہ رہی تھی۔

تاریکیوں میں چمکتی ہوئی کافوری شمع آہستہ آہستہ آسمانی راستہ طے کرنے لگی۔ سنہری کرنیں درختوں کی شاخوں پر سے سرک سرک کر تالاب میں گرنے لگیں۔ جو باغیچہ کے عین وسط میں تھا۔ چاند کی یہ کیفیت رات کے کسی سنہرے خواب کی مانند تھی۔ جو کسی چمکیلے ستارے کی سنہری وادی کو چھوڑ کر کسی نازنین کی نشیلی آنکھوں میں سمانے کے لئے زمین پر اتر آئے۔ جمیلہ عالم محویت میں سیوتی کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ اسکی روح کرن کرن نہ

جانے کہاں سے کہاں اڑی چلی جارہی تھی۔

یکایک کہیں قریب ہی وائلن کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ وائلن کی آواز میں اسقدر سوز اور رس تھا۔ کہ جمیلہ کا دل بے اختیار اسکی طرف کھینچنے لگا۔ آواز کی دھن پر جھومتی، لہراتی وہ کوٹھی کی عقبی دیوار کے پاس نکل آئی۔ اور گلو کی بیل کے پاس کھڑی ہو کر غور سے سننے لگی کہ آواز کسطرف سے آرہی ہے۔ چند لمحوں تک وہیں کھڑی رہی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دیوار کی طرف بڑھی۔ اور چپکے سے دیوار کے اوپر سے جھانکر دیکھا۔ ساتھ والی کوٹھی کے باغیچے میں گلاب کے پودوں کے پاس ایک نوجوان کھڑا وائلن بجا رہا تھا۔ گھنگریالے بال۔ کشادہ پیشانی موٹی موٹی موہنی آنکھیں۔ بلند اور ستواں ناک۔ کتابی چہرہ۔ لمبی گردن۔ چوڑا سینہ جمیلہ کو یہی معلوم اسکے خوابوں نے انسانی شکل اختیار کرلی ہے اسکی رگ رگ میں وائلن بجنے لگے۔ وہ نئی روشنیوں میں اٹھنے لگی۔ جمیلہ نے ایک جھرجھری لی۔ پیچھے ہٹی۔ اور نہ جانے کس خیال کے زیر اثر۔ زمین پر سے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر پھر دیوار کی طرف بڑھی اور چپکے سے دوسری طرف جھانکا۔ نوجوان اپنی دھن میں مست وائلن بجا رہا تھا۔ جمیلہ نے نشانہ باندھ کر کنکر اسکی طرف پھینکا اور جلدی سے نیچے بیٹھ گئی۔ کنکر نوجوان کے شانے پر لگا۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ پھر وائلن بجانے لگا۔ جمیلہ نے پھر ایک اتنا ہی کنکر اٹھایا اور نوجوان کی طرف پھینکا۔ جو اس کی کنپٹی پر لگا۔ اب تو اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سوچنے لگا کہ یہ کنکر کون مار رہا ہے؟ یہ کہاں سے آرہے ہیں؟ چنار کے یہ لانبے لانبے درخت آسیب زدہ تو نہیں یہ حرکت ضرور کسی آسمانی ہستی کی ہے۔ جو اپنے ماہتابی سفر میں موسیقی سے متاثر ہو کر یہاں اتر آئی ہے۔ ابھی وہ انہیں خیالات میں گم تھا۔ کہ چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز اسکے کانوں میں پڑی۔ اور اسکے فوراً ہی بعد ایک اور کنکر اسکے قدموں میں آکر گرا۔ اسکی متجسس نظروں نے آس پاس ہر جگہ کنکر مارنے والے کی تلاش کرنا شروع کی۔ چنار کے درختوں کے آس پاس مرکی بیلوں کے قریب۔ کوٹھی کے دروازے کی طرف۔ اور پھر وہاں سے ہٹ کر اسکی نظریں ساتھ والی کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف اٹھیں۔ کافی دور تک پھیلی ہوئی گلو کی بیل کے پاس کوٹھی کی دیوار کے پیچھے پیازی رنگ کے ڈوپٹے کا پلو ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ آخر یہ کیا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ اس دیوار کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے؟ اس کوٹھی میں رہنے والوں میں سے تو وہ کسی کو بھی نہیں جانتا۔ لیکن ایسی شرارت سوائے آشنا کے اور کوئی نہیں کر سکتا لیکن یہ ضروری نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ شرارت ہے

ایک نا آشنا ہستی سے بھی کی جاسکتی ہے۔ شرارت جو ہوئی۔ اس نے دائلن گلاب کے پودوں کے پاس ہی نیچے گھاس پر رکھ دیا۔ اور مچلے ہوئے قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا۔ اور دیوار پر پھر پھراتے ہوئے آنچل کے پاس پہنچ کر وہ نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور نظریں آنچل پر گاڑ دیں سنٹ کی تیکھی تیکھی خوشبو آنچل سے ٹپک ٹپک کر اسکی روح کی گہرائیوں میں ملنے لگی۔ آہستہ آہستہ، ہولے ہولے ایک مرمری بازو آگے بڑھا۔ اس نے جلدی سے لپک کر بازو کو پکڑ لیا۔ اور کھڑا ہو گیا۔ ایک دلفریب چہرہ اسکی آنکھوں کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ مسحور سا ہو گیا بولنا چاہتا تھا۔ لیکن لب نہیں کھلتے تھے دل یہی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو دیکھتا چلا جائے۔ دیکھتا چلا جائے۔ نظریں نظروں سے ملیں کچھ کہا۔ جھک گئیں۔ جمیلہ نے شرماتے ہوئے چہرہ دوپٹے کے آنچل میں چھپا لیا۔ اس نے دوپٹے کا آنچل ایک طرف ہٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ کلائی والا ہاتھ چھوٹ گیا۔ جمیلہ شوخ و شنگ ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتے ہوئے پیچھے ہٹی۔ مسکرائی۔ اور بھاگ کر گلو کی گھنی بیل کے پیچھے غائب ہو گئی۔

تتلی گزر چکی تھی۔ لیکن اسکے سبک پروں کا ارتعاش ابھی تک فضا میں ملا ہوا تھا۔ اور آنچل سے پھوٹتے ہوئے سنٹ کی تیکھی تیکھی خوشبو

...ت یہی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسکے رونگ رونگ میں بس گئی ہے۔ خلا کی
نیلی نیلی وسعتوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے۔ گوشہ مشرق کی طرف تیز تیز بھاگتا
ہوا چاند ہوا کے جھونکوں سے چنار کے درختوں کی لہراتی ہوئی لمبی لمبی شاخیں
گلاب کے نوشگفتہ معطر پھول۔ نغمہ محبت الاپ رہے تھے۔ اسے یہی جان
پڑا۔ کہ کیوپڈ گلاب کے پھول کی رنگین پنکھڑیوں پر سے بیدار ہوا ہے۔ اور وہ
اپنے ترکش سے تیر کھینچ کر کمان میں جوڑ رہا ہے اس نے اپنا سینہ پھیلا دیا
اور کہا۔ اے محبت کے حسین دیوتا آج اپنا سارا ترکش خالی کر دے۔ اس
سینہ پر اسقدر تیر چلا کہ تیری چوٹوں پر آبلے اُبھر آئیں۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ کہ
اسکے پر لگ جائیں۔ اور اپنے آپ کو کھلی فضا میں چھوڑ دے۔ تاکہ وہ ایک پرندے
کی طرح اس فضا میں اڑتا پھرے۔ حتیٰ کہ اسکے پر اس اڑان سے تھک جائیں۔
اور وہ اس تھکن سے چور ہوکر اس مخملیں گھاس پر لیٹ جائے۔ اور سوچتا رہے
اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہے۔ چاند کی سنہری کرنوں کی ہلکی ہلکی بارش
میں گلاب کے پھول اسے اس لڑکی کے لبوں کی طرح نظر آتے تھے۔ سرخ
ترو تازہ، نازک بوسوں کی نمی سے بھیگے ہوئے۔

محبت کی چنگاری دونوں کے سینے میں پھیلی اور شعلہ بن گئی۔ صبح کے
وقت تھیلما اپنے کمرے کی کھڑکی میں بال سنوارا کرتی۔ مشرق سے سورج
کی ننھی تازہ کرنیں اسکے بالوں کو چومتیں اور وہ ان لمبے لمبے تاروں کو

حیرت سے دیکھا کرتا۔ کاش وہ ان بالوں کو چھو سکتا۔ اور ان کی ملائمت سے لطف اندوز ہو سکتا۔ جمیلہ کے بال کتنے سیاہ تھے۔ جیسے سردیوں کی راتوں کی تمام سیاہی اسکے بالوں میں جذب ہو گئی ہو۔ اور اسکے ہونٹ۔ اسے رات کو سونے نہ دیتے تھے۔ آہ۔ کتنے سرخ تھے وہ۔ وہ اکثر اسے دیوار کے پاس آنے کا اشارہ کرتا۔ اور جمیلہ اسکی طرف مسکرا کر دیکھتی۔ اس کی مسکراہٹ میں کتنی روشنی تھی۔ صبح کی سنہری سنہری دھوپ میں اسکے ہونٹ اور چمکنے لگتے۔ لبوں پہ اور سرخی آجاتی۔ اور وہ اپنے سیاہ، ریشمی بالوں میں نہایت تیزی سے کنگھی کرنے لگتی۔ کبھی کبھی وہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی۔ آواز دھیمی ہوتی تھی۔ نہایت ہی مدھم اور شریں۔ اس لئے وہ لفظوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا۔ کہ وہ لفظوں سے مفہوم کو سمجھ سکے کیا آواز کی موسیقی جمیلہ کی دبی دبی خواہشوں کو بے نقاب نہیں کرتی تھی۔ وہ بیقراری میں دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگتا۔

ساتھ والی کوٹھی اور اسکے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہوتی تھی۔ دیوار کوئی اونچی نہ تھی۔ وہ اس دیوار کو بڑی آسانی سے پھاند سکتا تھا لیکن پھاندنے کی اسے کسی طرح جرأت نہ پڑتی تھی کبھی کبھی جمیلہ اسے کھڑکی سے لگتے ہوئے پردے کی اوٹ میں دیکھنے لگتی۔ صرف وہ اسکی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا۔ ان آنکھوں کی ہر حرکت سے

آشنا ہو چکا تھا۔ پلکوں کی ہلکی سی جنبش، ابروؤں کے ہلکے کھینچاؤ سے وہ لڑکی کے جذبات کو پڑھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایٹریلیوں پر کھڑی ہو کر اسے دیکھتی۔ تو وہ اسکے رخساروں اور لبوں کو دیکھ لیتا۔ صرف ایک ثانیئے کے لئے۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ لڑکی کے لب حرکت کرتے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے بادلوں میں بجلی کوندی ہے۔ لڑکی کے لبوں کی جنبش۔ اسکی آنکھوں کے بے پناہ تڑپ۔ اسکے رخساروں کی ہلکی سی چمک۔ وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ کبھی کبھی جمیلہ اپنی بڑی بہن صفیہ کی چھوٹی لڑکی ندرت کو اٹھا کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ اور اسے زور زور سے چومنے لگتی۔ وہ بوسوں کی اس نازک و لطیف لذت بھری آواز کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا جائے۔ اور اسے اپنی باہوں میں جکڑ کر اتنے زور سے چومے کہ اسکی روح کی بھوک اور تشنگی ہمیشہ کے لئے مٹ جائے۔ وہ ہر روز یہی تہہ کرتا۔ لیکن یہ ارادہ ہمیشہ ارادہ ہی رہا۔ وہ اس پر کبھی عمل نہ کر سکا۔

(۶)

کمرہ بالکل تاریک تھا۔ پرسکوت فضا میں پروفیسر مرزا کے خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ جمیلہ بستر پر بے چینی میں ادھر ادھر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے یہی معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اسکی نس نس میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں چارپائی پر لیٹے ہوئے سوچ رہی تھی۔ کہ شادی سے پہلے کتنی خوش و خرم رہتی تھی وہ۔ یہ بے چینی، یہ گرمی گرمی سی، یہ اعضا کا تناؤ سا۔ یہ شب بیداری، یہ آہیں، یہ کروٹیں اس نے کبھی محسوس نہ کی تھیں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ پہلے وہ سوتی تھی تو اسے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے شادی ہوئی۔ پروفیسر مرزا کے گھر میں آئی اس کی نیند اڑ سی گئی۔ اسے عجیب عجیب قسم کے خواب آنے لگے لبوں پر وہ پہلی سی مسکراہٹ نہ رہی۔ نہ آنکھوں کی وہ چمک۔ اب رخسار بھی اتنے سرخ نہ تھے۔ وہ پیلے اور زرد ہو گئے۔ وہ شعریت کہاں گئی۔ بستر پر کروٹیں لیتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔ وہ موسیقی کیوں مٹ گئی؟ حسن کا سرچشمہ کیوں خشک ہو گیا؟ جوانی کے چمن میں خزاں کی خنک ہوائیں کیوں چلنے لگیں ابھی انکے چلنے کا وقت تو نہیں آیا

پھول ویسے ہی معطر و رنگین ہیں۔ آسمان میں پاکیزہ روشنیاں اسی طرح جھلملا رہی ہیں۔ چاند ویسا ہی منور ہے۔ ہواؤں کا ترنم ابھی تک قائم ہے۔ لیکن وہ بالکل بدل گئی ہے۔ بالکل بدلتی جا رہی ہے۔ جمیلہ نے سر کو ایک جھٹکا دیا اٹھی اور تکیے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اسکی آنکھوں کے سامنے بیتے ہوئے لمحے اڑتے چلے گئے۔

کتنا خوبصورت ہے یہ لڑکا۔ جو ساتھ والی کوٹھی کے باغیچے میں کھڑا وائلن بجایا کرتا ہے رہ رہ کر اسکی طرف دیکھتا ہے۔ دیکھتا رہتا ہے۔ سرد آہیں بھرتا ہے۔ مسکرا دیتا ہے۔ کتنا پیارا لگتا ہے۔ جبکہ وہ کرسی پر اپنی ٹانگوں کو اکٹھا کئے بیٹھا ہوتا ہے۔ سامنے برآمدے میں دروازے کی محراب کے نیچے۔ اور کبھی دروازے کے باہر جھک کے نیچے بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوتا ہے۔ اسکی رانیں پیٹ سے ہمکنار ہوتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھی ہوئی ہوتی ہیں کبھی اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھے عرصہ تک ویسے ہی چپ چاپ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر کسی جذباتی ہیجان میں اپنے جسم کو سکیڑ لیتا ہے۔ اپنے پیٹ کو ٹانگوں سے بھینچتا ہے۔ اور ہاتھ کو رانوں میں دباتا ہوا آسمان کی طرف تکتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ اسے اشارے بھی کیا کرتا ہے۔ آنکھوں سے۔ ہاتھوں سے۔ سر کی جنبش سے۔ ان اشاروں کا مطلب کیا ہے؟ اس نوجوان کو دیکھکر اسکے جسم میں ایک

کپکپی سی کیوں دوڑ جاتی ہے۔ جمیلہ کا دل چاہتا تھا کہ دیوار پھاند کر اسکے پاس چلی جائے۔ ہمیشہ کے لئے۔ پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔

کھڑکی کھٹ سے کھلی۔ دیواروں سے لٹکتے ہوئے پردے ہلنے لگے۔ ہوا کے تیز تیز جھونکوں میں کہیں نزدیک ہی بجتے ہوئے وائلن کی دھیمی دھیمی آواز ملی ہوئی تھی۔ جمیلہ چونک پڑی۔ اسکا دل آواز کی جانب نہ جانے کیوں کھچنے لگا۔ چند لمحوں تک وائلن کی آواز کو بڑے غور سے سنتی رہی پھر نہ جانے دل میں کیا ترنگ اٹھی۔ کہ چپکے سے چارپائی پر سے نیچے اتر آئی۔ لیکن ابھی وہ جوتی ہی پہن رہی تھی۔ کہ پروفیسر مرزا نے بھنسے کی طرح پھنکارتے ہوئے دوسری طرف کروٹ لی۔ جمیلہ جلدی سے چارپائی پر آ بیٹھی اور لیٹ گئی۔ کامل سکوت کے چند لمحے یونہی گذر گئے۔ وہ پھر اٹھی۔ لیکن ابھی اس نے زمین پر پہلا قدم ہی رکھا تھا۔ کہ پروفیسر مرزا کو کھانسی اٹھی۔ کھوں کھوں کھانسنے لگا۔ جمیلہ نے جلدی سے پاؤں اوپر اٹھا لیا۔ اور چادر اوڑھ کر دم بخود ہو گئی۔

(۷)

موسم بہار کی ایک دلکش و دلفریب صبح تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سورج کی ارغوانی شعاعیں سفید رنگ کے ہلکے ہلکے بادلوں کو چیرتی ہوئی باہر نکل رہی تھیں۔ درختوں کے اردگرد اور ہوا میں ابابیلوں کے غول اڑنے لگ گئے تھے نئے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے فضاؤں کو معطر کر دیا تھا۔ افق کے خلا کی لامحدود نیلاہٹوں تک پھیلے ہوئے کنارے پر سے ہلکا ہلکا شور اٹھ اٹھ کر ساری دنیا پر محیط ہوتا جا رہا تھا۔ جمیلہ ٹہلتے ٹہلتے گلو کی بیل کے پاس جا پہونچی۔ جو کہ کوٹھی کی عقبی دیوار کے بالکل قریب ہی تھی۔ جمیلہ اس نوجوان کو اسی بیل کی اوٹ میں چھپ چھپ کر تاکا کرتی تھی۔ گلو کے چوڑے چوڑے ہرے پتوں پر تیلیاں بیٹھی اڑنے کو پر تول رہی تھیں عجیب و غریب رنگوں کی ننھی ننھی تیلیاں۔ اور ان ..... میں سے ایک تو اچھی خاصی بڑی تھی۔ اور ان سب سے خوبصورت۔ پر و بال باقی کی تمام تیلیوں سے کہیں زیادہ رنگین اور چمکیلے تھے۔ جمیلہ کو وہ بہت ہی پیاری لگی۔ اسے پکڑنے کے لئے دبے پاؤں آگے بڑھی اور ہوئے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن تتلی

بھی اس سے ناواقف نہ تھی کہ اسکی طرف ایک ہاتھ اسے پکڑنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ جونہی کہ جمیلہ کا ہاتھ اسکے قریب پہنچا پھر سے اڑ گئی۔ اور اسکے اڑتے ہی باقی کی تتلیاں بھی پھر پھر ہوا میں اڑنے لگیں۔ جمیلہ اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ اور مایوس پیچھے لوٹی۔ ابھی وہ گلو سے چند قدم دور گئی ہو گی کہ نیلے رنگ کا لفافہ اسکے قدموں میں آگرا۔ جمیلہ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ حیرت و شوق سے کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھا لیا۔ لفافہ معطر تھا۔ بھینی بھینی خوشبو نے جمیلہ پر ایک کیف سا طاری کر دیا۔

خط نکالکر اسے کھولا۔ اور پڑھنے لگی۔

خط کا مضمون یہ تھا۔

جانِ تمنا۔

آج جبکہ پیمانہ صبر بالکل لبریز ہو چکا ہے۔ آپکو یہ خط لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے۔ کہ آپ میری اس جرأت کو معاف کر دیں گی۔ کیونکہ جو کچھ لکھ رہا ہوں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔ دل میرے بس میں نہیں۔ میں دل کے بس میں ہوں۔ اور اور میرا دل آپکے بس میں۔ آپ نے میرے ساتھ وہ کیا ہے۔ جو سورج کی شعاعیں شبنم کے ساتھ کرتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو آپ

اسدن کے بعد مجھے اپنا رخ روشن نہ دکھائیں۔ ہمیشہ کے لئے چھپ جائیں میری نظروں سے۔ اور میں یہ سمجھتا کہ کاہکشاں کا ایک سنہرا سپنا دیکھا تھا۔ اور سپنے جہاں سے آتے ہیں وہیں چلے جاتے ہیں۔ میں دل کو یہ کہکر سمجھا لیتا۔ کہ وہ پری جس نے اس دیوار کے پیچھے چھپ کر کنکر پھینکے تھے۔ چاندنی رات میں دنیا کی سیر کرنے آئی تھی۔ پھر سماوی روشنیوں میں واپس چلی گئی۔ نورانی مخلوق کا خاکی مخلوق سے کیا تعلق۔ میں آپکو بھول جاتا۔ بھلا دیتا۔ خواب سمجھ کر۔ پری تصور کرتے ہوئے۔ بھول جاتا۔ بھلا دیتا۔ لیکن اس حالت میں آپکو بھول جانا کتنا مشکل کام ہے جبکہ آپ ہر روز سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے نظر کے سامنے آتی ہیں۔ اور ہستی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ کیسے کہوں کہ اسوقت میری کیا حالت ہوتی ہے اے کاش اسوقت میں ایک پھول بن جاؤں۔ اور ہوا مجھے آپ کے لانبے لانبے کالے بالوں میں ٹانک دے نغمہ بن جاؤں۔ اور آپکی موہنی آنکھوں کے راستے سے ہوتا ہوا آپکے دل کے قریب تھرکنے لگوں کیسے بتاؤں کہ اسوقت کتنی امیدیں کتنے ارمان میرے دل میں مچلنے لگتے ہیں۔ آیئے۔ خدا کے لئے قریب آیئے۔ یہ دوری اچھی نہیں۔ مرا جاتا ہوں۔ پگھلا جاتا ہوں۔ اس آگ کو بجھایئے۔ اس مردہ جسم

میں ایک نئی زندگی پھونکئے۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میں آپکا دیوانہ ہوں۔ میری پاکیزہ محبت کی قدر کیجئے۔ محبت قدر کرنے کی چیز ہے۔ کیا چکور کی پرواز اسے چاند سے ہم آغوش کر سکتی ہے؟ کیا ایک بھکاری ایک ملکہ کے دل میں جگہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ چاند ہیں میں چکور۔ آپ ملکہ ہیں اور میں بھکاری چکور چاند سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے۔ بھکاری ملکہ سے دل کی بھیک مانگتا ہے۔

بتائیے خدارا بتائیے۔ میری یہ ان تھک کوششیں کامیاب بھی ہو سکیں گی یا نہیں؟

میری محبت کا انجام مایوسی ہوگا یا مسرت و شاد کامی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر وقت سوچتا ہوں۔ ہر گھڑی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیا آپ مجھے یہ سمجھانے کی زحمت گوارا کریں گی۔ کہ میں کہیں غلط فہمی میں مبتلا تو نہیں۔ میں خود فریبی کا شکار تو نہیں ہو گیا۔ لیکن نہیں ایک نامعلوم طاقت مجھے کہتی ہے۔ کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے۔ آپ کے چہرے کی اڑی اڑی سی رنگت اور بکھرے ہوئے بال آپکے سوز دروں کی غمازی کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ کو مجھ سے محبت نہ ہو تو آپ یوں چھپ چھپ کر نہ دیکھیں۔ رہ رہ کر نظر کے سامنے

نہ آئیں۔ گنگناتے ہوئے نظر غلط انداز سے نہ دیکھیں۔ بال سنوارتے ہوئے مسکرایا نہ کریں۔ خود ہی کہئے اسے کیا سمجھوں؟

خان بہادر شیخ عطاء اللہ آپ کے ہمسائے میرے سگے ماموں ہیں۔ میں یہاں بی۔ اے کا امتحان دینے کے لئے آیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مجھے اس سے بھی کہیں مشکل ایک اور امتحان دینا پڑے گا۔ جسمیں شائد میں کامیاب نہ ہوسکوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں یہاں آنے کی بجائے کسی ہوٹل میں قیام کرتا۔ عمر بھر کی پریشانیاں تو گلے نہ پڑتیں۔ لیکن حیفرت کچھ پڑھی بڑے ستم ظریف ہیں۔ کہاں کہاں سے گھیر لاتے ہیں اپنے شکار کو۔ نہیں دیکھتے کہ یہ پردیسی ہے۔ کمزور ہے۔ ناتواں ہے۔ بس تیر چلایا گھائل کیا۔ اور چھوڑ دیا۔ تڑپنے والا تڑپا کرے۔ رونے والا روتا رہے انکی بلا سے یہ ایک طرف کھڑے ہنستے چلے جاتے ہیں۔ انکی ہنسی ٹھٹری اور وہ بیچارا جان سے جاتا ہے۔ افسوس کرتا ہوں۔ پچھتاتا ہوں کہ میں یہاں آیا ہی کیوں۔ میری تقدیر۔

اتنا طویل اور بے معنی خط پڑھتے پڑھتے شاید آپکا نازک دماغ گھبرا گیا ہوگا۔ لیکن یہاں دل یہ چاہتا ہے۔ کہ لکھتا چلا جاؤں۔ لکھتا چلا جاؤں۔ لیکن نہیں لکھ سکتا۔ آپ کی دائمی پریشانی کا خیال مدنظر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اس خبط کو اتنی لمبی چوڑی بکواس

سمجھتے ہوئے ایک طرف پھینک دیں۔ اور وہ باتیں جنہیں میں آپ کے کانوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ نہ پہنچ سکیں۔ لہٰذا اس خط کو ختم کرنے سے پیشتر صرف چند سطریں اور لکھتا ہوں۔ صرف چند سطریں۔ کیونکہ پہلے آپکو یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ میرا امتحان کل تک ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد مجھے واپس گھر لوٹ جانا ہوگا۔ میں لائل پور کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد صاحب وکالت کرتے ہیں۔ میرے دو بھائی اور بھی ہیں۔ بڑے بھائی آج کل ولایت میں ہیں۔ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سال نہیں یہ ڈگری مل جائے گی۔ چھوٹا بھائی ابھی سکول میں پڑھتا ہے۔ کل گھر سے خط آیا تھا۔ کہ والد صاحب سخت بیمار ہیں۔ جسکی وجہ سے طبیعت سخت بے چین ہے اگر یہ خط نہ آتا تو امتحان ہو چکنے کے بعد بھی کافی عرصہ یہیں رہتا لیکن والد صاحب کی علالت میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ میں یہاں بیٹھا رہوں۔ لہٰذا چند ایک دن تک یہاں سے چلا جاؤنگا۔ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپتا ہوا اس شہر سے نکلوں۔ اور ایک زخم لاعلاج لئے ہوئے اپنے گھر کو چلا جاؤں۔ اور ساری عمر اس کی تکلیف سے تڑپا کروں۔ اگر آپ ایسا نہیں چاہتیں تو آج رات

کو بارہ بجے کے قریب مجھے گلو کی بیل کے قریب ملئے گا۔ میں وہیں آپ کا انتظار کرونگا۔ ضرور آیئے گا۔

آپ کا اور ہمیشہ آپ کا

جمیل

خط کا آخری جملہ ختم ہوتے ہی جمیلہ کو یہی محسوس ہوا کہ اسکے سر کے اوپر خوشنوا پرندوں کی ایک دنیا چہچہا رہی ہے۔ شاخیں پھولوں کے بھار سے جھک جھک پڑتی ہیں۔

چشمے اُبل رہے ہیں۔ بھونرے بھنبھنا رہے ہیں۔ اور وہ ایک تتلی کی طرح گوناگوں رنگوں کی روشنیوں میں اڑتی چلی جا رہی ہے "آج رات کو بارہ بجے کے قریب مجھے گلو کی بیل کے پاس ملئے گا۔ میں وہیں آپکا انتظار کرونگا۔ ضرور آیئے گا" اسے یہی معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے کانوں میں ہر طرف یہی آواز آرہی ہے "رات کے بارہ بجے۔ گلو کی بیل کے پاس۔ میں آپ کا انتظار کرونگا۔ ضرور آیئے گا"

وہ جوشِ مسرت سے ہانپنے لگی۔ بھاگی بھاگی کمرے میں گئی۔ اور پلنگ پر دھم سے گر پڑی اسکی نس نس سے نغمے پھوٹ رہے

تھے۔ ادھر اُدھر کروٹیں بدلنے لگی۔ چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ چند لمحوں تک ویسے ہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر چادر اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ تکیہ اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اسے خوب ہی بھینچا۔ خوب ہی چوما۔ وہ جوشِ مسرت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"آج رات کو بارہ بجے۔ گلو کی بیل کے پاس۔ میں آپکا انتظار کرونگا۔ ضرور آیئے گا۔"

وہ تڑپ کر بستر پر سے اٹھی۔ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ انگڑائی لی۔ اور انگڑائی کی قوس کے ٹوٹتے ہی کولہے مٹکائے ہوئے ناچنے لگی۔ وہ جوشِ مسرت سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ پھر آئینہ دیکھا۔ آنکھیں مٹکائے ہوئے۔ گردن کو جھٹکا دیکر۔ سینہ ابھار کر۔ کمر کو ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔ بال کھول کر پریشان کر دیئے۔ ہونٹوں پر لپ سٹک لگائی اور پھر دوپٹہ لٹکائے ادھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ معاً سے خیال آیا۔ کہ کہیں وہ خط کے جواب کا انتظار نہ کر رہے ہوں۔ لپک کر اس نے کھڑکی کھولی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور میں موسری کے نئے کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔ موسری کے درخت کی پھولوں سے بھری ہوئی شاخیں کھڑکی کے ڈھنڈے شیشیوں سے ٹکرا کر ایک مبہم سی موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ پتے ہوا کے جھونکوں سے لرز

رہے تھے۔ مگر وہ انکی لرزشوں کے دس پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کافی عرصہ تک وہ ساتھ والی کوٹھی کے باغیچے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ لیکن وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں سے ہٹی۔ اور میز پر سے سنڈٹ اٹھا کر جسم پر چھڑکنے لگی۔ اور پھر ایک شوخ و شنگ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ جوش مسرت سے پاگل ہوتی جا رہی تھی۔

"رات کو بارہ بجے۔ گلو کی بیل کے پاس۔ میں آپ کا انتظار کرونگا۔ ضرور آیئے گا۔"

(۸)

مست مست انگڑیاں سوز شاعرانہ سے معمور تھیں۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹوں سے شراب رس رہی تھی۔ ہلکا ہلکا زیور پہنا ہوا تھا۔ ماتھے پر پتی دار جھومر۔ ناک میں کنول کیل۔ کانوں میں ایک ایک دریچہ۔ گلے میں چندن ہار۔ مرمری کلائیوں میں جڑاؤ چوڑیاں۔ ہاتھوں میں موتیوں کی دست بند۔ جسکی پڑیوں میں یاقوت جڑے ہوئے تھے

سیپیا رنگ کی ساری باندھی ہوئی تھی۔ جس میں ٹکے ہوئے ستارے بجلی کی روشنی میں جگر جگر کر رہے تھے۔ پاؤں میں زربفت کی اونچی ایڑی کی گرگابی تھی۔ جمیلہ کو دیکھ کر یہی گماں ہوتا تھا۔ کہ عمر خیام کی کسی رباعی نے انسانی شکل اختیار کر لی ہے۔

پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح لچکتی ہوئی آئینے کے روبرو آئی۔ جیسے نیند اسی آنکھوں میں نیند آئے۔ اور شاعر وارفتہ کے دماغ میں رنگین خیال۔ بڑا مزہ رہے گا۔ اس نے آئینہ دیکھتے ہوئے کہا۔ بڑا لطف آئے گا۔ وہ آئیں گے۔ ستاروں کی جھلملاہٹوں اور چاند کی کرنوں میں لپٹے ہوئے۔ وہ آئیں گے۔ دھیمے دھیمے ہولے ہولے گنگناتے ہوئے وہ آئیں گے۔ گلو کی گنھیری بیل کے پاس۔ ہاں وہیں۔ انہوں نے خط میں یہی لکھا تھا۔ کہ میں تمہیں وہیں ملونگا۔ گلو کی گنھیری بیل کے پاس۔ بڑا مزہ رہے گا۔ بڑا لطف آئے گا۔ گلو کی گنھیری بیل کے پاس سنہرے پنکھے تھرک رہے ہونگے۔ رنگین نغمے مچل رہے ہونگے۔ میں ان سے لپٹ جاؤنگی۔ ان کی چھاتی سے سر لگا کر سو جاؤنگی۔ کھو جاؤنگی۔ انکی سانسوں سے نکلتی ہوئی خوشبوؤں میں۔ انکی آنکھوں سے نکلتی ہوئی روشنیوں میں۔ سو جاؤنگی۔ کھو

جا ڈنگی۔ اسکے جسم میں ایک رو اٹھی۔ ابھری۔ آگے بڑھی۔ ساری کا پلو درست کرتے ہوئے آئینے کے آس پاس ٹہلنے لگی۔ پھر آئینہ دیکھا مسکرائی اور گانے لگی۔ ہولے ہولے دھیمے دھیمے سروں میں۔ چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی نرم نرم لہریں۔ بجلی۔ گرمی۔ روشنی۔ ترنم۔ اسکے لبوں میں ترنم تھا۔ اسکے جسم میں ترنم تھا۔ اسکی آواز میں ترنم تھا۔ اس کی آنکھوں میں ترنم تھا۔ اسکی کمر کی لوچ میں ترنم تھا۔ اسکے لانبے قد میں ترنم تھا۔ اسکے بالوں میں ترنم تھا اسکی ہلکی ہلکی سانس کی ہر جنبش میں ترنم تھا۔ دھیمی دھیمی نرم لہریں۔ ترنم بکھیرتی ہوئی اسکی ساری ہستی پر بکھرتی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر تک وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی رہی۔ پھر اس نے باہر جھانکا۔ باغیچہ ویران پڑا تھا۔ وہ برآمدے میں نکل آئی۔ چاروں طرف ستارے مسکرا رہے تھے۔ گویا کچھ کہہ رہے ہوں۔ سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ وہ مڑی اور نہ جانے کس دھن میں کوٹھی کی عقبی دیوار کی طرف چل دی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے گلو کی گنیری بیل کے پاس آہٹ سنی۔ اسکا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایک سایہ تاریکی میں پیرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔ عقب سے مضبوط باہوں نے اسے آغوش میں لے لیا۔ اسکا سر ایک

چوڑی سی چھاتی پر جا لگا - بدن میں اک پھوار سی اڑی - اور حلق میں آ اٹکی - آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں - جسم سن سا ہو گیا - ہلکی سی چیخ گلے سے نکلی - رات کی گہری خاموشی میں کھو گئی - سانس اکھڑ گیا - سسکیاں لینے لگی آسمان پر ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پھلجھڑی کی طرح گرنے لگے - مضبوط ہاتھ نے اسکا منہ موڑا - اسکے لبوں پر شہد کے قطرے ٹپکنے لگے - اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں پھیلی ہوئی پتلیوں میں ایک پر رونق چہرہ اسکی مدہوش آنکھوں کے سامنے چمکا - وہ چونک پڑی - دیوتا مسکرایا - داسی نے اپنے حسن کے رنگین و شگفتہ پھول اسکے چرنوں میں بچھا دیئے - ٹن ٹن ٹن - چھن چھن چھن محبت کے مندر کی نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں - چاندی کے دیئے جھلملا اٹھے - اور انکے جھلملانے سے ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی - جیسے بہار کی میٹھی میٹھی دھیمی دھیمی معطر ہواؤں کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے - اسکی رگ رگ میں طوفان اٹھا - آگے بڑھا - جسکی شدت نے اسے ادھ موئی کر کے پھینک دیا - اور وہ یوں اس گرم سینے سے لپٹ گئی - جیسے کوئی طوفان زدہ ناؤ ساحل سے جا چمٹتی ہے -

---

(۹)

وہ درخت کے تنے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ اسکی نظریں سامنے کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا۔ تو درخت کی شاخیں سرسرانے لگتیں۔ اور انکے سرسرانے سے ایک عجیب سی دلفریب آواز پیدا ہوتی جیسے کوئی بربط کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو۔ وہ گردن اوپر اٹھا کر جھومتی ہوئی شاخوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ درخت پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ سرخ سرخ پھول اسے جمیلہ کی طرح نظر آتے تھے۔ سرخ، تر و تازہ نازک بوسوں کی نمی میں بھیگے ہوئے۔ کبھی کوئی پرندہ درخت کی نازک ٹہنی پر آتا۔ اور اپنے نرم و نازک پروں کو ہلاتا ہوا چہکنے لگتا جیسے اسے جمیلہ کا کوئی پیغام دے رہا ہے۔ ہلکی ہلکی بارش۔ ہوا کے مست مست جھونکے۔ سرسراتی ہوئی شاخیں۔ اور ان سے نکلتی ہوئی موسیقی۔ کون جانتا ہے کہ اسوقت اسکے دل میں کیسی کیسی امنگیں تیز تیز سانس لے رہی تھیں۔

یکایک حریری ملبوسات کی سرسراہٹ اسکے کانوں میں پڑی۔ اس نے جلدی سے پیچھے مڑکر دیکھا۔ جمیلہ اسکے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسکی مسکراہٹ میں کیا کچھ نہ تھا۔ جیسے سارے ستارے سمٹ کر اسکی مسکراہٹ میں آگئے ہوں۔ اسکی رگ رگ میں شہنائیاں بجنے لگیں اس نے جمیلہ کے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا۔ ان پر بارش کے چند ننھے ننھے قطرے تھرک رہے تھے۔ اسکی نگاہیں سیاہ بالوں سے ہوتی ہوئیں اسکی سپید کھلی پیشانی کو چھوتی ہوئی اسکی ناک، کان، رخساروں اور لبوں کو مس کرتی ہوئی اسکے سینے کی طرف بڑھیں۔ وہاں سفید ریشمی دوپٹہ شانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ نگاہیں بڑھتی گئیں۔ پھیلتی گئیں ذہن پر تاریکی چھاگئی۔ نرم و نازک غیر مرئی تاریکی۔ پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کی طرح۔ بجلی کی لہر آنکھوں میں تڑپنے لگی۔ کان سرخ ہوگئے اور آنکھیں نہایت بیباکی سے کپکپاتی ہوئی اسکی ٹانگوں کی طرف بڑھیں شلوار پتلے سے سفید ریشم کی تھی۔ جمیلہ کی رانیں صاف نظر آرہی تھیں کتنی سفید جلد تھی۔ اور اس جلد پر ہلکی پتلی سی سرخ لکیریں۔ وہ اس جلد کو چھونا چاہتا تھا۔ یہ سفیدی کیا ہے یہ سرخی کیا ہے؟ اس گوشت میں کیا بھرا ہے؟ اسکی ننھی ننھی شریانوں میں خون دوڑ رہا ہے پھولوں کی رنگینیاں۔ خوشہ انگور سے رستی ہوئی شراب۔ اس حسین پیکر

کی مٹی کو شفق کی سرخیوں سے نم تو نہیں کیا گیا تھا؟ اگر وہ اس گوشت کو چھوئے تو کیا محسوس کرے گا؟ یہ سفید سفید لکیریں کدھر جاتی ہیں۔ وہ سر سے لیکر پاؤں تک لرز گیا۔

"آؤ۔ آگے آؤ" اس نے آغوش پھیلاتے ہوئے کہا۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کوئی غیبی طاقت اس سے یہ الفاظ کہلوا رہی ہے۔ اسکے خون میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اسکے رخسار آتشیں ہو گئے۔

"آؤ۔ میرے قریب آؤ" اس نے پھر محبت بھرے لہجہ سے کہا۔

جمیلہ آگے بڑھی۔ دونوں ہم آغوش ہو گئے۔

آہستہ آہستہ تاریکی آسمانی وسعتوں پر سے پھیلنے لگی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی۔ جنگلوں میں سے گذرتی ہوئی، ندیوں پر تھرکتی ہوئی، چشموں کو چھیڑتی ہوئی، درختوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی۔ ان کے گرد اگرد لپٹنے لگی۔ تاریکی۔ گہری۔ خاموش تاریکی۔

(۱۰)

وہ صوفے پر اپنی ٹانگوں کو اکٹھا کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی رانیں پیٹ سے ہمکنار ہوتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی ٹھوڑی

کو گھٹنوں پر رکھتے ہوئے باہر نظر دوڑائی۔ شام ہونے میں چند گھڑیاں باقی تھیں۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا۔ تو وہ سرد آہ بھرتے ہوئے دوگن بیلا کے درخت کی طرف دیکھنے لگتا۔ دوگن بیلا کا درخت سرخ سرخ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ چوٹی کی ایک ٹہنی پر خوشنما شاما بیٹھی چہک رہی تھی۔

اسکی نگاہیں دوگن بیلا کے درخت سے ہٹ کر سامنے کھڑکی پر جم گئیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ پردہ ہل رہا تھا۔ مولسری کے درخت کی شاخیں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی ہوئی ایک مبہم سی موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ اسے یہی جان پڑا کہ ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا اسے کھلی فضا میں لے اڑا ہے۔ جلدی سے صوفے پر سے اٹھا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کوٹھی کے باغیچے میں پہنچ کر اس نے پھر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ پردہ ہل رہا تھا۔ مولسری کے درخت کی شاخیں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی ہوئی ایک مبہم سی موسیقی پیدا کر رہی تھیں پرندے چہچہاتے ہوئے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اور اس میں ایک خواب آور

ترنم ملا ہوا تھا۔ آسمان پر سے ایک نمناک تاریکی اتر رہی تھی۔ جیسے حوریں بہشت بریں کے منور دریچے کھولکر مشک و عنبر اڑا رہی ہوں۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا وہ دیوار کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ پردہ ہل رہا تھا۔ اسکی نگاہیں پردے کی ہر ہر سروٹ میں نہ جانے کسے تلاش کرنے لگیں۔ ایکا ایکی پردے کے پیچھے ایک دبا ہوا نقرئی قہقہہ سنائی دیا۔ اور اس قہقہے کے ساتھ ہی اس کی ساری ہستی سماعت بن گئی۔ کائنات کی تمام آوازوں میں اسکے لئے صرف یہی اک آواز تھی جو اسقدر لطیف و شیریں ہوسکتی تھی۔ ممکن ہے کہ معطر و شگفتہ گلاب اپنی شہد ٹپکانے والی بلبل کو بھول جائے۔ اور اس کے بدلے کسی دوسرے پرندے کے لغمے پر اپنا حجاب رخ اٹھا دے لیکن وہ اس قہقہے کی آواز کو پہچاننے میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ بیتاب ہوگیا۔ پورے زور سے اچھلا۔ اور دیوار پھاند گیا۔ پردہ ہل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ آگے بڑھتا گیا۔ اور پردے کے قریب جاکر رکا۔ پردہ ذرا سرکا ہوا تھا۔ اس نے سامنے ٹھہر کر اندر نظر دوڑائی ہلکی ہلکی نیلی روشنی میں ایک مانوس حسین پیکر کا سایہ لرز کر رہ گیا۔ اس کے جسم میں اک روانی۔ آگے بڑھی۔ اس کے نہ جانے کس جذبے کے تحت لپک کر پردہ ایک طرف ہٹا دیا۔ جمیلہ پیٹھ موڑے

ہوئے کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے چپکے سے اس کے لانبے لانبے بالوں کو پکڑا۔ اور چومنے لگا بالوں سے نہایت ہی دلفریب خوشبو آرہی تھی۔ اسکی رگ رگ میں غنچے چٹکنے لگے اسکی ساری ہستی خوشبوؤں میں بس گئی وحشت و ریوانگی کے عالم میں وہ جمیلہ کے بالوں کو چومتا رہا۔ چومتا رہا۔ اور پھر اسکے ہاتھ جمیلہ کے باتوں پر سے پھسل کر اسکی نازک کمر پر آگئے۔ جمیلہ چونک پڑی۔ اور پلٹ کر دیکھا۔

"آپ۔ ہائے اللہ" اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور کتنی ہی ننھی ننھی لٹیں اسکے ماتھے پر بکھر کر رہ گئیں۔

"آپ یہاں کیوں آئے"؟

"آپ نے بلایا جو تھا"

"میں نے؟" وہ کانپ رہی تھی "اونہہ میں نے کب بلایا۔ اچھا اب آپ چلے جائیے"

وہ خاموش رہا۔ اور جمیلہ کی کلائی کو پکڑلیا۔

"چھوڑیئے نا" جمیلہ نے کلائی چھوڑاتے ہوئے کہا۔

"کوئی آجائے گا تو سخت رسوائی ہوگی۔ خدا کے لئے یہاں سے چلے جائیے۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔ جائیے۔ آپ جاتے کیوں نہیں؟"

"اچھا چلا جاتا ہوں" اس نے کہا "لیکن اتنا تو بتا دیجئے۔ کہ آپ مجھے دیکھ کر چھپ کیوں جاتی ہیں؟ اور پھر چھپ چھپ کر دیکھتی بھی ہیں"

"مجھے کچھ معلوم نہیں" جمیلہ نے کہا "آپ جائیے۔ یہاں سے چلے جائیے"

"جی نہیں" اس نے کہا "جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گی۔ میں یہیں کھڑا رہونگا۔

"اچھی بات ہے" جمیلہ نے کہا۔ اور چلنے کے لئے آگے بڑھی وہ کود کر کھڑکی کے اندر چلا گیا۔ اور جمیلہ کا دوپٹہ پکڑ لیا۔

"چھوڑیئے" وہ جھنجھلا اٹھی "نادان نہ بنیئے"

"آپ نے مجھے سخت پریشان کیا ہے"

"اچھا دوپٹہ چھوڑیئے"

"اونہہ ہونہہ"

"ہائے اللہ۔ میں کیا کروں"

وہ خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بیٹھئے بھی اللہ"

وہ پھر بھی خاموش رہا۔ اور وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ایک بار اسکی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر سامنے دروازے کی طرف منہ کر لیا اس نے دوپٹہ چھوڑ دیا۔ اور سامنے آکر چہرے پر سے ہاتھ ہٹانا چاہا۔ جمیلہ نے زور سے جھٹک دیا۔ مگر یہ دیکھ کر وہ سخت پریشان ہو گیا کہ وہ رو رہی ہیں۔

"ارے آپ تو رو رہی ہیں؟" وہ کچھ کھسیانہ ہو گیا۔

"لیجئے میں جا رہا ہوں۔"

کمرے کے دروازے کے باہر قدموں چاپ سنائی دی۔

"جائیے۔ جلدی جائیے۔ کوئی آرہا ہے" جمیلہ نے کہا۔

"لیکن آج رات کو آپ ضرور ملیں گی نا؟"

"ہاں، ہاں۔ ضرور ملونگی۔ جائیے۔ جائیے"

وہ کھڑکی سے کود کر باہر چلا آیا۔ کچھ نادم، کچھ پریشان۔ کھڑکی سے باہر کھڑا پردے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اسکا جی چاہا کہ لپک کر پردہ پھر ہٹا دے۔ لیکن اسکے لپکنے سے پیشتر ہی پردہ برابر ہو گیا۔ اور کھڑکی بند۔

جمیلہ کھڑکی کی چٹخنی لگاتے ہوئے پیچھے ہٹی۔ اور صوفے پر آبیٹھی

پروفیسر مرزا سگریٹ کے دھوئیں کے بادل ہوا میں اڑاتا ہوا کمرے کمرے میں داخل ہوا۔ بائیں ہاتھ میں ایک لمبا سا کاغذی بکس تھا۔

"میری حسین و جمیل عروس" پروفیسر مرزا نے محبت بھری آواز سے کہا۔

"میں تمہارے لئے ایک نہایت ہی خوبصورت ساری لایا ہوں جسے پہن کر تم تتلی سے بھی زیادہ دلکش و رنگین دکھائی دو گی۔ آؤ ساتھ والے کمرے میں آؤ۔ شیشے کے سامنے اسے باندھکر دیکھو"

جمیلہ مسکراتی ہوئی صوفے سے اٹھی۔ پروفیسر مرزا نے اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

"حکم ہو تو چائے لے آؤں حضور" خادمہ نے پروفیسر مرزا سے پوچھا۔

"ہاں لے آؤ" پروفیسر مرزا نے دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "دوپہر کی چائے ابھی تک نہیں پی۔ سخت مصروف رہا۔ جمائیاں آ رہی ہیں۔ سر میں گرانی سی محسوس کر رہا ہوں"

"تو پھر حضور آج زعفرانی قہوہ پئیں۔ تمام تھکاوٹ، بے حسی اور جملہ بدمزگیاں دور ہو جائیں گی"

"اچھا تو آج زعفرانی قہوہ پلاؤ" پروفیسر مرزا نے کہا۔

"بہت فرحت بخش ہوتا۔ لیکن ذرا جلدی تیار کرو"

"پانی پہلے ہی سے گرم رکھا ہے" خادمہ نے کہا "پانچ منٹ میں تیار

ہو جائے گا۔"

خادمہ چلی گئی۔ پروفیسر مرزا نے بٹن دبا کر لیمپ جلایا۔ کمرہ جگمگا اٹھا۔ کھڑکیوں میں سے مست کن خوشبو میں بسی ہوئی ہوا بے روک ٹوک کمرے میں تیر رہی تھی۔ ساری چیزیں ترتیب سے سجا کر رکھی ہوئی تھیں سنگار میز کا شیشہ صاف چمک رہا تھا۔ بجلی کی روشنی سے اس میں سے رنگین شعاعیں نکل رہی تھیں۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ وادی شفق کی رنگین پریاں اپنے برفانی محلوں کے دریچوں میں سے نکل نکل پرواز کر رہی ہیں۔ شیشے کے پاس ہی ایک طرف آبنوسی میز رکھی تھی۔ جس پر خوشنما گلدان میں تازے پھول مہک رہے تھے۔ اور فرش پر بچھی ہوئی قالین پر سنہری پاندان چمک رہا تھا۔

پروفیسر مرزا اور جمیلہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

پروفیسر مرزا نے کاغذی بکس کھولا۔ اور اس میں سے قوس قزح کے سے رنگوں کی ساری نکالی۔ اور مسکراتے ہوئے جمیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں کیسی ساری ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔" جمیلہ نے متبسم لہجہ سے کہا۔

"بہت پیارے رنگ ہیں۔"

"تمہیں پسند ہے نا؟"

"جی ہے۔"

"سو روپے میں آئی ہے۔"

"سو روپے میں؟"

"ایسا ریشم تو بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔" پروفیسر مرزا نے کہا۔

"بڑا نفیس ریشم ہے۔ دیکھو نا۔"

جمیلہ نے ساری پروفیسر مرزا کے ہاتھ سے لے لی۔ اور اسے دیکھنے لگی۔ پروفیسر مرزا کی نظریں اسکے سرخ و سپید چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ بجلی کی دودھ سی روشنی میں وہ شبنم سے دھلے ہوئے نرگس کے پھول کی طرح شگفتہ نظر آرہی تھیں۔ وہ خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کہ اے میری ہستی کی رونق میرے دیار دل کی حسین تریں آبادی۔ اے مرمریں آبشاروں کے ترنم۔ وادی کاہکشاں کے رنگین خواب۔ رباب ماہ کے دلکش ترانے۔ میری اپنی جمیلہ تیرے سامنے لیلیٰ کی ملاحت، شیریں کی صباحت اور دیول دیوی کی

نزاکت کا ذکر کرنا فطرت کی صناعیوں کے گویا ابتدائی نمونے پیش کرنا ہے میں سمجھتا ہوں۔ کہ صنمیات یونان کی تمام وہ حسین دیویاں جنکے نام شعر و نغمہ کا موضوع قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پھولوں کی طرح تھیں جو گلدستے کے حاشیے پر نظر آتے ہیں۔ اور تو اس گلدستہ کا مرکزی گلاب ہے۔ وینس کی ہستی اگر ایک قوم کی عقیدت مندیوں کا نتیجہ تھی۔ سائکی کا وجود اگر شعرا کی خیال آفرینیوں کا ماحصل تھا۔ تو تو میرے لئے وجہ پرستش ہے۔ تیرے جلووں کی دنیا قوس قزح کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ تیرے تنفس کی فضا پھولوں کی نکہت سے بسی ہوئی ہے تیری حرکات میں موجوں کا لوچ شامل ہے۔ تیرا جسم خوبانیوں کے گداز اور سیبوں کی شرینی سے مملو ہے۔ اور کہ تیرے سارے پیکر میں حوروں کی لطافت آسودہ ہے۔ بوڑھا اپنی نئی نویلی دلہن کے دن بدن نکھرتے ہوئے حسن کو دیکھ کر جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ خوش تھا کہ اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردیاں اور آنکھوں کے نیچے پڑے ہوئے سیاہ حلقے مٹ گئے ہیں۔ غم واندوہ اور حزن وملال کے وہ سیاہ بادل جنہوں نے اس چاند کو تاریک کر رکھا تھا۔ چھٹ گئے ہیں۔ وہ جمیلہ میں سماتا جاتا جا رہا ہے جمیلہ اس میں۔ ساز محبت کے دونوں تار مل رہے ہیں۔ اے کاش اسے کوئی بتا سکتا۔ کہ تو خود فریبی

کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ رونق یہ بشاشت جسے تو جمیلہ کے چہرے پر تھرکتے ہوئے دیکھتا ہے۔ تیری وجہ سے نہیں۔ اسکا باعث کچھ اور ہی ہے۔ یہ بشاشت یہ رونق کسی اور کو دیکھنے سے اسکے چہرے پر آجاتی ہے تو نہیں جانتا کہ تیری عزت کی دیوار میں ایک جوان ڈاکو نقب لگا رہا ہے۔ جسکا تجھے اسوقت پتہ چلے گا جبکہ تو لٹ چکا ہوگا۔ بے خبر ہستی خواب دیکھے جا۔ اور اس خواب نوشین سے کبھی بیدار نہ ہو۔ کیونکہ تیری روح کے لئے یہ آخرین فرصت لطف و مسرت ہے۔ قبل اسکے کہ تیرے خواب کی مسرتیں تجھ سے چھین لی جائیں۔ اپنے پیکر جذبات کو آغوش خیال میں لیکر جسقدر لطف حاصل کرسکتا ہے کرلے۔ اس تبسم ذی حیات کا خواب دیکھ لے۔ جس نے تیرے دل کو اپنی روشنی سے بھر دیا ہے۔ آہ تیرا خواب۔ جسکی شیرینی و لطافت تیرے دل کی تنہا روشنی ہے عنقریب ہی اڑ جانے والا ہے۔ اور تیری ساری مسرتیں ساری خوشیاں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور تیرے دل کی ویرانی اس ساز کی سی ویرانی ہوگی۔ جو اپنے تاروں کے ٹوٹ جانے کے بعد ایک کونے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اسکے نغمے اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ بے خبر ہستی۔ تیرا غم ایک ایسا غم ہوگا۔ جسکے لئے عقل و تدبیر کی کارفرمائیاں بھی بیکار ثابت

ہوتی ہیں۔

وقت آنے والا ہے۔ کہ یہ نازنین، یہ حسین ساحرہ جسکی ہر نگاہ تیرے دل پر مسرت بے پایاں کے گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ اور تیرا رواں رواں اسطرح مسکرانے لگتا ہے جسطرح کہ برسات کا سب سے پہلا چھینٹا پڑتے ہی ہر ذرہ مسکرانے لگتا ہے۔ یہی نازنین، یہی حسین ساحرہ تجھے دھوکہ دے گی۔ یہی خوبصورت ناگن تجھے ڈسے گی۔ یہی۔ جسکے لبوں سے نکلی ہوئی آواز تیرے کانوں کے لئے خدوس گوش ہے۔ اور تو تمنا کرتا ہے۔ کہ تیری ساری زندگی اسی فضا میں گذر جائے۔ جہاں یہ سانس لے رہی ہے۔ اسکی ہنسی تیری نظروں کے لئے طلسم دلکشی ہے اور اسکی ہر حرکت میں تجھے ایک جلوہ نظر آتا ہے۔ اور ہر وہ چیز، کسی ہار کا ہر وہ پھول، کسی زیور کا ہر وہ نگینہ جسے جمیلہ چھو لیتی ہے۔ تیرے لئے ایک مقدس چیز بن جاتی ہے تو اسے چومتا ہے۔ آنکھوں سے لگاتا ہے۔ اسکی ہستی کے تمام جزئیات کا مطالعہ کرنے میں محو ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسکا لہجہ، اسکی نگاہیں، اسکی تمام حرکات، تجھ میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ تو اسکی آواز میں بات کرتا ہے۔ اس کے لبوں سے ہنستا ہے۔ اور اسکے چہرے کا ہر انداز

تیرے چہرے میں منعکس ہو کر نمودار ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ دلکشیاں، یہ تبسم، یہ آسودگیاں، مستقل طور پر تیرا اور طرف تیرا حصہ نہیں ہیں۔ گویا یہ تیرے پاس اس لئے آئی ہیں کہ تیری جرم محبت کی خطار کا روح کو گم گشتہ آسودگی پر سر دھننے کے لئے تاریکیوں میں چھوڑ جائیں۔

خادمہ قہوہ لے آئی۔ میز صوفے کے سامنے رکھ کر اس پر قہوہ دانی اور پیالیاں اور رکابیاں لگا دیں قہوے کا زعفرانی رنگ۔ میوے کا حلوہ۔ کھوئے کا حلوہ، گاجر کا حلوہ، جس پر پڑی ہوئی پستے کی باریک ہوائیاں کسی سلیقہ مند ہاتھ کا پتہ دے رہی تھیں۔ سرخ گرم سموسے، گلاب جامن اور انہیں چاندی کی طشتری میں سجانے کا جاذب نظر انداز۔ کتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ زعفرانی قہوے کا دور چلنے لگا۔

ہر طرف تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے پھسلتے ہوئے۔ جنگلوں میں سے گذرتے ہوئے۔ درختوں سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے پتوں کو چومتے ہوئے۔ تاریکی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ ستارے یکے بعد دیگرے خلا کی بیکراں وسعتوں میں نمودار ہو رہے تھے۔ باغیچے میں کھڑے ہوئے درختوں کے پتے رات کے دودھیلے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ جمیلہ کے بالوں کو چومنے اور اسکے جسم کو چھونے سے اسکے دل و

دماغ میں ایک عجیب جنونی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ کھڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن کھڑکی بند تھی۔ کسی کے لب جنبش کرتے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے کسی کی آنکھیں اب مسکراتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ زندگی جامد ہے۔ غیر متحرک ہے۔ اس اسکی ہر حرکت، ہر جنبش پر ایک اندھی طاقت ایک اندھی قوت نے قبضہ کر لیا ہے۔ ناچار اسکی نگاہیں کھڑکی سے ٹکراتی ہوئی سورسری کی شاخوں کی طرف رہ رہ کر اٹھ جاتیں۔ اس ذہنی کشمکش اس نفسی جمود نے اسکے دماغ پر ایک عجیب اثر ڈالا ہوا تھا۔ اب اسکا ذہن زہر آلود ہو گیا تھا۔ وہ وہ اپنے کنپٹیوں پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے کسی کے سرخ ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ کسی کی غزالیں آنکھیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اپنے دل کی لڑکھڑاتی، ادنگھتی غیر مسلسل چیخیں شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح اسکے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ اور اسے قلبی اور ذہنی اذیت پہونچا رہی تھیں۔ اس لئے آگے بڑھ کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر کسی جذباتی ہیجان کے زیر اثر کھڑکی کے شیشوں کو انگلی سے ٹھکورا کھٹ کھٹ شیشوں سے آواز نکلی۔

"کون ہے؟" بھاری آواز میں کسی نے پوچھا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کون ہے؟" پھر وہی آواز اندر کمرے میں گونجی۔ وہ وہاں سے ہٹا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ پیچھے گھوم کر دیکھا نوکروں کے کوارٹرز کی طرف تاریکی میں بجلی کی روشنی سسک رہی تھی ماحول کچھ بوجھل سا تھا۔ اور سناٹے پر غنودگی طاری تھی۔ اس کا دم اکھڑنے لگا۔ جسم میں جھرجھری سی ہوئی۔ گوشت پھڑک اٹھا۔ گلو کی گھنی بیل کے پچھلی طرف قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دیوار پر دونوں ہاتھ رکھکر اچھلا۔ اور دوسری طرف جا گرا۔ نیچے زمین پر ٹوٹا ہوا گملا پڑا تھا۔ دائیں گھٹنے پر اس زور سے لگا کہ خون بہنے لگا۔

ساری فضا ایک راحت بخش سکون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر چیز ایک گہری نیند میں محو نظر آرہی تھی۔ اور بہت دور ستارے آہستہ آہستہ جھلملا رہے تھے۔ باغیچے کے درخت بن پر تاریکی نے اپنا غلاف چڑھا دیا تھا خاموش سانسیں لے رہے تھے۔ گویا وہ ایک ایسے عاشق کا سینہ ہیں جو تازہ مبتلائے عشق ہوا ہے۔ اور اسقدر تازہ کہ اگر وہ تپش و تڑپ میں مقید نہیں ہے تو آرام و سکون حاصل کرنے سے بھی محروم ہے۔

جمیلہ کھڑکی میں کھڑی خیالات کے تانے بانے الجھا سلجھا رہی تھی۔ اور وہ خیالات یہی کہ اسکی محبت وہ کھلی ہوئی محبت نہ تھی۔

جسے دنیا کی نظریں پسند کر لیتی ہیں۔ جسکا پیمان زمین پر باندھا جاتا ہے۔ اور مہر آسمان پر ثبت ہوتی ہے۔ اسکی محبت وہ محبت نہ تھی، جو ابتسام الفت اور تعشق ازدواج کی مسرتوں کو دل کے اندر گرہ نشاط بنا دیتی ہے اسکی محبت کا شعلہ تو ضبط و خاموشی اور غم و اندوہ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔ اسکا جذبہ الفت انبساط و امید سے معرا تھا۔ اور ناجائز طریقے پر حاصل کی ہوئی دولت کی مانند اس کی روح کے عمق میں دفن تھا۔ اسکی محبت ایک ایسی مورت تھی جسکا نہ کوئی نام ہوتا ہے نہ استھان۔ اور جسکا حسین دسوگوار پرستار اسوقت جبکہ کائنات محو خواب ہوتی ہے، دیدۂ انجم کی طرح بیدار رہتا ہے۔

جنت نشان ہندوستان کے کنجائے باغ میں کبھی کبھی ایسی حسین و خوشرنگ چڑیا نظر آجاتی ہے۔ جسکا کوئی نام نہیں، صرف یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ وہ نسیم کے جھونکے کے ساتھ کسی ایسے جزیرے سے اڑ آئی ہے۔ جہاں ہنوز انسانی تلاش و جستجو کے قدم نہیں پہونچے۔ پھر یہ چڑیا دیکھنے والے کی نگاہوں کو ایک قلیل فرصت کے لئے مسحور کر کے جس طرح آتی ہے اسی طرح چلی جاتی ہے۔ جمیلہ بھی اپنے تئیں کسی ایسے

ہی کنج میں سمجھتی تھی اور اپنے عاشق کو کسی ایسی ہی چڑیا سے تعبیر کرتی تھی۔ یہ خیال کہ اسکا محبوب اس چڑیا کی طرح غائب نہ ہو جائے گا۔ اسکے لئے اذیت روح کا باعث ہوا کرتا تھا۔ اور وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے "خدا نہ کرے" کہکر اس اندیشے کو رفیع کرنیکی کوشش کیا کرتی تھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی اسوقت اسی قسم کے خیالات کے تانے بانے الجھا سلجھا رہی تھی۔

چاند چنار کے لانبے لانبے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہوا۔ اور اپنے شباب کی لطافت سے تمام موجودات کو غرق تنویر کر دیا۔ فطرت اس دریائے نور میں نہا نہا کر نکھرنے لگی۔ دو گن بیلا کے درخت کے پاس اس نے ایک سایہ رینگتا ہوا دیکھا۔ کبھی رینگتا ہوا اسطرف جاتا تھا۔ کبھی اسطرف جمیلہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"ہائے میرے اللہ۔ نہ وہ بلاتے ہیں نہ مجھے قرار آتا ہے"

جمیلہ نے بلی آواز سے کہا۔

"ابھی تک ہیں گھوم رہے ہیں۔ کتنی محبت ہے انہیں میرے ساتھ۔ میری طرح دیوانے ہو رہے ہیں۔ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے ملنے کا وعدہ جو کیا تھا۔ بیرحم جمیلہ وہ تڑپ رہے ہیں اور تجھے اسکی کچھ خبر ہی نہیں۔ پاس رہتے ہوئے بھی دور رہتی

ہو۔ تجھے کون کہے کہ آسمان کی وسعتیں بھی پرواز محبت کے لئے سطح ہموار سے زیادہ نہیں۔ اور تو اس قد آدم دیوار کو نہیں پھاند سکتی حیف ہے تجھ پر۔ مسلک عشق میں سکون بجز کا انتظار روا نہیں۔ اس میں کود پڑنے کا وقت تو وہ ہے جبکہ طوفان اپنی زندگی کی ساری طاقتیں صرف کر رہا ہو۔ اگر پروفیسر مرزا ابھی تک اپنے کمرے میں جاگ رہا ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ چل اسکے پاس چل۔ جو تیری انتظار میں زخمی پرندے کی طرح سسک رہا ہے۔ چل اسکے پاس چل۔ جسکی نیندوں میں تو نے زہر بھر دیا ہے۔

کسی جذباتی ہیجان کے زیر اثر وہ وہاں سے ہٹی۔ اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

کوٹھی کے عین وسط میں ایک حوض بنا ہوا تھا۔ جس میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ فوارہ چل رہا تھا۔ اور اسکا پانی نیچے حوض میں گرتے ہوئے ایک پرکیف نرنم پیدا کر رہا تھا۔ حوض سے کافی دور مغرب کی طرف آم کے پیڑوں کے جھنڈ تھے۔ جن سے چھن کر مہتاب کی سنہری کرنیں ہری ہری گھاس پر رقص کر رہی تھیں۔ وہ بیقراری کی حالت میں حوض کے پاس ٹہل رہا تھا۔

"وہ آئے گی۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے

آواز میں کہا۔ میری زندگی کی رونق۔ میری روح کی روشنی ایک خواب بن کر نہیں بلکہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ شگفتہ و معطر پھولو اپنی نکہت سے فضاؤں کو معطر کر دو۔ خوش رنگ و خوش نوا پرندو دل چہچہاؤ۔ آسمان کے منور ستارو۔ آؤ اور اس باغیچہ کے فرش زمردیں پر بچھ جاؤ۔ کیونکہ میرے پاس تم سے منور جواہرات نہیں ہیں۔ جو کہ میں اپنی محبت کی قدمبوسی کے لئے راستوں پر بکھیر سکوں۔"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اور متجسس نظروں سے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں ماہتاب ... کرسی اور بلندی ... اور باغ کی فضائیں تجلیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی بے پایاں گہرائیوں میں ڈوب گئیں۔

"تھوڑی دیر کے بعد میرا چاند بھی اس طرف سے طلوع ہو گا" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا چاند بھی اس طرف سے طلوع ہو گا۔ پھر ایک چاند آسمان پر ہے۔ دوسرا زمین پر ہو گا۔ فضائیں تجلیوں سے جگمگا اٹھیں گی۔ فطرت مسکرائے گی اور فضائے قدسیہ کا ذرہ ذرہ

موسیقی سے لبریز ہو جائے گا۔ خوف رسوائی سے دھڑکتے ہوئے دو دل ایک دوسرے سے پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کی طرح ٹکرائیں گے۔ اور کائنات پر محبت برسے گی۔ بہشت کی فضائیں اس باغ میں آجائیں گی۔ پھر میں چکور کی طرح اپنے چاند کا طواف کرونگا بھونرے کی طرح اپنی رنگین کلی کا منہ چومونگا۔ آہ۔ کتنا لطف آئے گا۔ کتنا مزہ رہے گا۔"

یکایک اسکی نظر پھولوں کی کیاریوں کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ ایک شگفتہ گلاب نے اسکے دل میں امنگوں کا فوارہ ہی تو اچھال دیا۔ چاند کی سنہری کرنوں نے گلاب کے پھول کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ معاً سے خیال آیا۔ کہ اسے توڑ لینا چاہیئے۔ اور جب اس کی روح کی روشنی آئے تو وہ اس پھول کو اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں میں ٹانک دے

"آفتاب کی جلوہ بہ جلوہ تجلیاں" اس نے گلاب کے پھول کی طرف جاتے ہوئے آہستہ آواز میں بولنا شروع کیا۔

"کہکشاں کی معور شاہراہیں۔ رات کے بحر ظلمت میں ڈوبتے ہوئے تاریک سائے ماہتاب کی عشوہ زا کرنیں۔

غم زندگی سے ٹمٹماتی ہوئی شمع اور اس پر زندگی نچھاور کرتے ہوئے پروانے۔ یہ سب محبت کے ادنیٰ شاہکار ہی تو ہیں آؤ میری جمیلہ میری اپنی جمیلہ آؤ محبت کریں۔ اور زندگی کی خاموش فضاؤں کو نغمہ محبت سے پر شور کر دیں "

وہ جذبات کی رو میں بے دست و پا تنکے کی طرح بہتا ہوا گلاب کے پھولوں کے پاس پہونچ گیا۔ جمیلہ گاؤ کی گھیری بیل کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے خیالات کرن کرن اسے نہ جانے کہاں اڑے لئے جا رہے تھے۔

" وہ تھے اور میں تھی " اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا " ان کا آغوش تھا اور چاندنی تھی۔ فضائیں پر سکوت تھیں۔ اور انکی مسکراہٹیں ان میں ترنم پیدا کر رہی تھیں آہ۔ کیا دلفریب خواب تھا۔ آج میں پھر ان رنگین خوابوں کی وادی میں جاؤں گی۔ جہاں ستارے اپنی زریں قندیلوں سے چراغاں کرتے ہیں۔ جہاں پپیہا کہاں کہکر فضا میں اضطراب و اضطرار کی دنیا پیدا کر دیتا ہے۔ جہاں

ناکام آہیں رنگیں بگولہ بنکر عالم بالا تک پہونچتی ہیں۔ جہاں فردوس
بریں کی تجلیاں تبسم کے خاموش سمندر کی پرسکون لہروں پر رقص
کرتی ہیں۔ میں ضرور جاؤنگی اس رنگین وادی میں۔ اس خوابوں
کی بستی میں۔ اس نغموں کی دنیا میں۔ تب وہ آئینگے۔ ضرور آئینگے
اپنی کنیز سے ملنے۔ میں ان سے ہم آغوش ہو جاؤنگی۔ وہ مجھے
اپنے سینہ سے لگا لینگے۔ پھر ہم مسکرائینگے۔ دنیا مسکرانے لگے گی
ستارے ہنسیں گے۔ چاند ناچے گا۔

وہ جذبات کی رو میں بے دست و پا تنکے کی طرح بہتی جا
رہی تھی۔ بہتی جا رہی تھی۔ اس کشتی کی طرح جس کے چپو ٹوٹ
پکے ہوں۔ اور ہوا کے تیز و تند جھونکے جس طرف چاہیں اسے
لے جائیں۔

"رات کو پریشان خواب مجھے سونے نہیں دیتے"
اس نے بیقرار سانس لیتے ہوئے کہا۔
"میری آہیں مجھے سانپ بن بن کر ڈستی ہیں۔ رات
کی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی تنہائیوں میں میرے سوز و
ساز میں ڈوبے ہوئے نالے رات بھر کائنات کی لامحدود
وسعتوں میں گونجتے ہیں۔ میری آرزوئیں کمرے

کی تاریک فضاؤں میں اس طرح آوارہ پھرتی ہیں۔ جیسے رات کے تاریک سایوں میں پرواز کرتا ہوا پرندہ جس کا کہیں گھونسلہ نہ ہو۔ ستاروں کے منور جزیروں کو عبور کرتے ہوئے میرے پریشان خیالات شہری آبادی سے دور کسی ویرانے کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ پھر جس وقت وہ میرے قریب ہوتے ہیں بہت قریب جلتی ہوئی شمع کے قریب پروانے کی طرح ندی سے سکوت سینے سے چمٹے ہوئے کنول کے قریب بھونرے کی طرح۔ آہ۔ وہ کس قدر شیریں لمحے ہوتے ہیں۔"

گلو کے پتے کھڑکھڑائے۔ وہ ایک طرف کو رہ گئی۔ اس نے سمجھا کوئی آ رہا ہے۔ لیکن نہیں وہ ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے کی شرارت تھی۔

وہ گلاب کا پھول ہاتھ میں پکڑے دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی روح فرسا ہوتی ہیں۔

"آجا میری روح کی روشنی آجا۔ اب دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔" اس نے مضطرب لہجے سے کہا۔ "آنکھیں تیری راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا چکی ہیں۔ دل تیری جدائی کے خیال

سے بیٹھا جاتا ہے۔ آجا میری زندگی آجا۔ اب دیر نہ کر۔ ورنہ میں جان سے گذر جاؤنگا۔ اسی دیوار کے پاس سسک سسک کر جان دے دونگا۔"

ایکا ایکی حریری لباس کی سرسراہٹ اسکے کانوں میں پڑی۔ اور سرسراہٹ کے ساتھ ہی خاموش فضا میں چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ اسکی نظریں خود بخود اوپر اٹھ گئیں۔ جمیلہ دیوار پر جھکی ہوئی محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسکا چہرہ غمگین تھا لیکن اسمیں غضب کی دلکشی نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں ایک خاموش آگ دھیمی سی لو کے ساتھ جل رہی ہے۔ جمیلہ کی لانبی لانبی زلفیں دیوار سے نیچے سانپ کی طرح ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ مانگ میں مقیش کی افشاں۔ صندلی پیشانی پر پتی دار جھومر۔ قوسی بھویں اور لمبی گھنیری پلکوں کے درمیان سرمہ کی ہلکی سی تحریر۔ سیپیوں کی طرح سانچے میں ڈھلے ہوئے کانوں میں ایک ایک دریچہ۔ ناک میں کنول کیل۔ گول اور سفید گردن میں نفیس سونے کا گلوبند۔ جسمیں زمرد اور مونگے جڑے ہوئے تھے۔ گداز اور سیمیں چھاتی بالکل کھلی تھی مرمریں کلائیوں میں

طلائی چوڑیاں۔ اور لانبی لانبی نرم و نازک انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی خوشنما انگوٹھیاں تھیں۔ ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹہ سیدھا آنچل مار کر اوڑھا ہوا تھا۔ جسکا ایک پلو خوبصورت حلقے اور شکنیں پیدا کرتا ہوا فضا میں پیچ کھا رہا تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی حور جنت آسمان کی تمام تر جلالتوں اور لطافتوں کو ساتھ لئے ہوئے زمین پر اتر آئی ہے۔

" آ عالم قوس قزاح کے خواب پراں میرے آغوش میں اتر آ۔ اور میری ساری ہستی کو اپنی پاکیزہ روشنیوں سے معمور کر دے "

شکیل نے دبی آواز سے کہا۔ اور ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ جمیلہ اس ہاتھ کا سہارا لیکر ایسے نیچے اتر آئی جیسے صبحدم کنول کی پتیوں پر اوس کے چمکتے ہوئے قطرے اترتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔

" آج تو تم نے بہت دیر لگا دی " شکیل نے ہر سکوت کو توڑا۔

جمیلہ بولی " پیارے میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے پاس جلدی آجاؤں۔ لیکن آج اس کی طبیعت میں خلاف

معمول کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اسکے مزاج میں کچھ عجیب سی پریشانی اور آشفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ میں اسکے مزاج کا بڑے غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی طبیعت میں عجیب وغریب وہم اور خدشے پیدا ہو رہے ہیں۔ جب تک وہ سو نہ جاتا تم ہی کہو کیسے آ سکتی تھی؟"

اتنا کہنے کے جمیلہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی آج کی شب اس کے عاشق کا جوش شوق ایک قسم کی افسردگی سے مملو تھا۔ اسکے چہرے پر خفیف سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جمیلہ نے اس کو اتنی پریشان حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اس غیر معمولی حالت کے باعث دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔

"دیکھتے ہو" جمیلہ نے مہر سکوت کو توڑا "چاند کی کرنوں کا تبسم کس درجہ شیریں ہے۔ میں اپنے تخیل کی بعض ساعتوں میں اکثر تمنا کرنے لگتی ہوں۔ کہ اس چھوٹے سے باغیچے کو پر لگ جائیں اور ہم۔ صرف آپ اور میں۔ اس باغیچے کی تنہا آبادی ہوتے اور کسی غیر معلوم سمندر کی سمت

اڑجاتے جہاں کسی نبض کو حرکت نہ ہوتی۔ مگر ہماری! اور جہاں ہم دونوں محبت کی زندگی بسر کرکے تنہا مرجاتے۔ جہاں ہم اس کلفت زار دنیا کی بیرحمیوں اور سرد مہریوں کی زد سے دور ہو جاتے۔ اور جہاں ہم کو کوئی نہ دیکھ سکتا مگر فرشتوں کی معصوم آنکھیں! ہماری یہ نرالی جنت مکروہات عالم سے یکسر پاک ہوتی۔ کیا آپ ایسی زندگی کو پسند کرتے؟" یہ کہکر وہ ایک شوخی تبسم کے ساتھ اس کی جانب مڑی۔ شکیل نے بازوؤں پر اپنی محبوبہ کو اٹھا لیا۔ اور دونوں بیلا کے درخت کے سائے میں لے گیا۔ جمیلہ کے جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہوگیا تھا۔ دونوں گھاس پہ بیٹھ گئے شکیل نے عالم بیخودی میں اپنی آغوش کھول دی جمیلہ بھی عشق کی پذیرائی کے لئے بڑھی۔

"میری پیاری جمیلہ" اس نے شدت جذبات سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "آنکھیں کھول۔ ایک مختصر لمحے کے لئے اپنی آنکھوں کے غرفوں میں مجھے وہ جنت دیکھ لینے دے۔ جس سے میرے بیتاب دل کو تسکین ہوا کرتی ہے۔ کیا مبارک تھا وہ ذریعہ جو ہماری آشنائی کا باعث ہوا۔ میری محبت۔ اگر دنیا کی تمام نعمتیں فراہم کردی جائیں۔ اور مجھے اختیار دیدیا جائے کہ ان میں سے انتخاب کرلو۔ تو اے میری زندگی۔ میری نگاہ انتخاب صرف تم پر

ہی پڑ سکتی ہے۔ اور اس وقت میں یہی باور کر رہا ہوں۔ کہ تمام عالم کی نعمتیں مجھے دیدی گئی ہیں۔ کیونکہ آج میں پھر اپنی جمیلہ کو اپنے پہلوئے شوق میں دیکھ رہا ہوں۔"

اس کے ایک بوسے سے جو کہربائی اثرات سے لبریز تھا۔ جمیلہ کی آنکھیں اس طرح کھل جاتی ہیں۔ جیسے برف ہوا کے اثر سے آہستہ آہستہ پگھل کر نیچے دبے ہوئے نیلگوں رنگ کے پھولوں کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اس کی نظریں شکیل کی آنکھوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھیں۔

"میری جمیلہ" شکیل پھر بولا "میری اپنی جمیلہ چل میرے ساتھ چل۔ اور اس جگہ کو چھوڑ دے۔ جمیلہ۔ پیاری جمیلہ۔ میری محبت۔ میرا عشق۔ اس سرخ گلاب کی مانند ہے۔ جو بہار کے کیف آفریں موسم میں کھلا ہو۔ میری محبت اس رشیلے سر کی طرح ہے۔ جو خوش آہنگی کے ساتھ ساز مطرب سے نکلتا ہے۔ میری محبوبہ۔ تیرا حسن تحسین سے بالاتر ہے۔ میری محبت کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ میں تیری محبت

کے نغمے الاپتا رہونگا۔ جب تک کہ سمندر کا پانی خشک نہ ہو جائے۔ میرے دل میں تیری ہی نشاط آگئیں الفت ہو گی۔ حتیٰ کہ میں موت کی آغوش میں خاموش ہو جاؤں۔ آچل میرے ساتھ چل۔ میری امیدوں کے مرکز۔ آؤ یہ دنیا ترک کر دیں۔ اپنے لئے ایک نئی دنیا بنائیں۔ جس کی تعمیر محبت کی بنیادوں پر رکھی جائے جسمیں بہار نغمہ گنگنائے۔ اور شفق کی سرخیاں مسکراتی ہوں۔ جہاں آفتاب کبھی نہ ڈوبے اور اندھیرا قدم رکھتے ہوئے خوف کھائے۔ جہاں کی چاندنی چاردن کی نہو۔ آبشاروں کے گرنے سے ایسا معلوم ہو گویا کسی نے ساز فطرت کو چھیڑ کر اسکے تاروں میں سوئی موسیقی کو بیدار کر دیا ہے۔ جہاں کا ہر نغمہ شراب موسیقی سے معمور اور ہر لمحہ کیف و مسرت میں ڈوبا ہوا ہو۔ آؤ میری زندگی اس جگہ چلیں۔ جہاں کیف و انبساط کی ہری بھری واریوں میں محبت آزادانہ کھیلتی ہے۔ تتلیاں مسکراتی ہیں۔ آرزوئیں خوشبو میں بس ہوئی فضا میں سانس لیتی ہیں۔ وہاں چلو میرے خوابوں کی ملکہ۔ دنیا کی شعلہ بار نگاہوں سے دور۔ جہاں محبت فضاؤں میں دلکش گیت گاتی ہوئی ناچتی پھرتی ہے۔ یہ دنیا تصویر ہے درد کی۔ جلتے ہوئے دلوں کی۔ اور تڑپتی ہوئی روحوں کی۔

یہاں ہمارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ آؤ وہاں چلیں۔ جہاں حسن و شباب کی رعنائیاں ہوں۔ جہاں چاند کی چمکیلی کرنوں پر شبنم رقص کرتی ہو۔ اور غنچوں کا نقرئی تبسم بکھرا کرے۔ چل میرے چمن حیات کے حسین باغبان میرے ساتھ چل۔"

جمیلہ بیقرار سانس لیتے ہوئے اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ اور کپکپاتی ہوئی آواز سے کہنے لگی۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں۔ تم مجھے اپنے ہمراہ لے چلو گے۔ خداوند، کیا میں اتنی خوش نصیب ہو سکتی ہوں۔ آہ! یہ مسرت تو ایک عمر کی اذیت و مصیبت کے معاوضے سے بھی بہت زیادہ ہے پیارے سہیل۔ سچ کہو۔ کیا تم مجھے، ایک تباہ کار ہستی کو اپنے ہمراہ لے چلو گے؟ اپنے دلنواز پہلو میں جگہ دو گے؟ اور کیا یہ ممکن ہے۔ کہ یہ لمحات تاثر و کیفیت۔ جن میں ہم دونوں اسقدر خوش اور آسودہ ہیں ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟ اگر یہ خواب ہے تو یہ ایک ایسا خواب ہے جس میں جنتوں کی عشرت پنہاں ہے۔ تمہارا قرب اب مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ ان ہونٹوں کے شریں نغمے ہر وقت میرے کانوں میں پہونچتے رہیں گے۔ یہ نگاہیں ہر لحظہ میری روح کو اپنی شرابوں سے سرشار کرتی رہیں گی۔ آہ۔ یہ کتنی خوشی

کی بات ہے۔ میں اس خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی ہوں لے چل میری کشتیٔ حیات کے کھویا۔ لے چل میری کشتی حیات کو جدھر جی چاہے لے چل "

جمیلہ نے اپنی مرمریں باہیں اسکی گردن میں ڈال دیں۔ شکیل کے لب آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے اس کے لبوں سے مل گئے۔ جمیلہ کی مست خواب آنکھیں نیند سے مغلوب ہوگئیں۔ اور جس آہستگی و سکون کے ساتھ گرمیوں میں خوشبو آتی ہے اسی خموشی و آہستگی کے ساتھ اسکے پپوٹوں پر نیند کا افسوں طاری ہو گیا۔ اور دفعتہً نسیم شب، ہلکے ہلکے سُروں کی ہم آہستگی سے لبریز ہو کر چلنے لگی۔

(۱۱)

پروفیسر مرزا مایوسی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ سر کے بال پریشان اور ہونٹ پپڑیائے ہوئے تھے۔ اس پریشانی و بے چینی کی وجہ یہ تھی۔ کہ اب سے کچھ دیر پہلے کتاب پڑھتے پڑھتے اسکی آنکھ لگ گئی۔ اور آنکھ لگتے ہی اس نے ایک خواب دیکھا۔ نہایت ڈراونا اور بھیانک خواب۔

پروفیسر مرزا کا سانس کچھ تیز ہو گیا۔ سینے میں جنبش سی پیدا ہوئی اور دبی آواز سے بولا۔

"خدا جانے ایسے بھیانک اور ڈراونے خواب کہاں سے آتے ہیں؟ پچھلے سال اسی قسم کا ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اس سے چند دن بعد پہلی بیوی چل بسی۔ پورے ایک سال کے بعد آج پھر ویسا ہی بھیانک اور ڈراونا خواب دیکھا ہے۔ اب خدا جانے کیا ہو گا۔"

جسطرح تیز تیز موجیں سمندر کی سطح پر ایک دوسری کا

تعاقب کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے خیالات اسکے دماغ میں تیز تیز لہراتے چلے جارہے تھے۔ اور انکا عکس اسکی مرجھائی ہوئی گہری آنکھوں میں دکھائی دے رہا تھا۔

جمائی لیتے ہوئے وہ صوفے پر سے اٹھا۔ لیکن آج وہ اپنے جسم میں ایک خاص کمزوری محسوس کر رہا تھا اٹھتے ہی فرش پر گرا۔ اٹھا اور اٹھتے ہی پھر اسکا پاؤں رپٹ گیا۔ پھر فرش پر آرہا۔ ایکبار اس نے آہستہ سے کہا

"آج تو میں اسطرح گر رہا ہوں جیسے کچھ پی گیا ہوں"

یہ کہتے ہوئے وہ ایک مدہوش شخص کی طرح اونگھتا اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکیوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ صحن میں کھڑا ہو کر کافی دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں جمیلہ سوئی ہوئی تھی۔ کمرہ قسم قسم کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے کہیں قریب ہی بجتے ہوئے وائلن کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی سے تھوڑی دور جمیلہ ایک نہایت ہی نفیس پلنگ پر سو رہی تھی۔ اسکے حسین پیکر کے گرد اگرد بالوں کا جال بکھرا ہوا تھا۔ جیسے کالے بادلوں میں کوئی منور ستارہ جگمگا رہا ہو۔ اسکے رسیلے ہونٹوں پر ایک جادو اثر

شیریں تبسم کھیل رہا تھا۔ پروفیسر مرزا اس سانس لیتے ہوئے مجسمہ حسن کو مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ جمیلہ کے حسن کے ساحرانہ اثرات سے اسکے کمزور جسم کی رگ رگ تھرتھرا اٹھی۔ دل میں ایک ترنگ اٹھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ جھکا اور جمیلہ کے سیپ کے سے ہاتھوں پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ کافی عرصہ تک ویسے ہی جھکا رہا۔ امرت کے دھارے اس کے حلق سے نیچے اتر کر اسکی روح کی گہرائیوں میں ملتے جا رہے تھے۔ عورت کی محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ اسکی ابتدا بہت ہی معمولی اور انتہا نہایت ہی شاندار ہوتی ہے۔ ابتدا میں یہ اس ندی کی طرح ہوتی ہے۔ جو کسی پہاڑ کے دامن سے پھوٹ نکلے۔ اور پھر بہتے بہتے سمندر بن جائے اتھاہ۔ ناپیدا کنار سمندر۔

پروفیسر مرزا کے سب جمیلہ کے ہاتھوں سے علیحدہ ہوئے۔ جھکی ہوئی گردن بلند ہوئی۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس آئینے کے پاس آیا۔ جو پلنگ سے تھوڑی دور میز سے پیوست تھا۔ معلوم نہیں کس خیال کے زیر اثر اس نے اپنا چہرہ دیکھنے کے لئے آئینے پر نظر ڈالی۔ اس نے دیکھا۔ کہ اسکا چہرہ زرد اور اندر دھنسا ہوا ہے۔ اسپر تبسم کی کوئی علامت نہیں۔ آنکھوں کا نور بڑھاپے کی تاریکیوں میں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔ جسم بالکل نحیف اور مخنی ہو چکا ہے۔

اعضاء ڈھیلے اور شانے پشت ہو چکے ہیں۔ وقت نے اسکی غارت گری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ کسی زمانے میں یہ بات اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ کہ پروفیسر مرزا ایسا خوب رو شہ زور اور کشیدہ قامت انسان ایسا جدل جائے گا۔ کہ اسے اپنی خوب روئی اور شہ زوری ایک خواب۔ ایک افسانہ نظر آنے لگے گی۔

جمیلہ کے زانو پر سر رکھ کر اب بھی وہ چاندنی میں سونے کا لطف لیتا ہے لیکن وہ لطف پیدا نہیں ہوتا جو جوانی میں پہلی بیوی کے زانو پر سر رکھ کر چاندنی میں سونے کا لطف آتا تھا۔ حالانکہ وہ جمیلہ اتنی حسین بھی نہ تھی اب بھی وہ دریائے زندگی کی ناچتی ہوئی لہروں کی آواز سنتا ہے۔ لہریں اٹھتی ہیں۔ بل کھاتی، اٹھلاتی، ناچتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں وہ پہلا سا ترنم نہ جانے کیوں نہیں رہا۔

سرد آہ بھرتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا۔ اور سونے کے لئے چارپائی پر آ بیٹھا۔ لیکن فوراً ہی اسکی آنکھوں میں وہ بھیانک خواب گھومنے لگا۔ ہولناک آندھی میں ادھر اُدھر منڈلاتی ہوئی ڈراؤنی شکلیں چیخ چیخ کر اسے گھورنے لگیں۔ وحشت میں چارپائی پر سے اٹھا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکیوں میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے سرگوشیاں

کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ شہر کی گلیوں میں بھونکنے والے کتے بھی خاموش ہو گئے تھے۔

خیالات سے بھرا ہوا دماغ لئے وہ چپکے سے کوٹھی کے باغیچے میں جا پہونچا۔ اور بیقراری میں ادھر اُدھر ٹہلتا ہوا اس دیوار کے قریب جا نکلا۔ جو اسکی کوٹھی کو ساتھ والی کوٹھی سے جدا کرتی تھی۔

ایکا ایکی دیوار کے قریب کھٹکا سا ہوا۔ اس کی نظریں خود بخود اوپر اُٹھ گئیں۔ دیوار پر ہوے ہوے ایک سایہ اسکی طرف سرک رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آخر یہ کیا ہے؟ وہی خواب تو نہیں جو اس نے اب سے چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔ شاید بھوت ہی نہ ہو۔ یہ ہوائی جسم بھی تو سائے کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ اپنی ساس کی بات کو معلوم ہوتا تھا کہ آج اسے ماننا ہی پڑے گا۔

اسکے اوسان جاتے رہے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ پیشیانی پسینے سے شرابور ہو گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر دیوار کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اوپر درخت کی شاخوں میں چھپے ہوئے کسی پرندے نے پروں کو پھڑپھڑایا۔ لانبی لانبی گھنی شاخیں ہلنے لگیں۔ سایہ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔

وہ خوف وہراس سے تھر تھر کانپتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ اور جمیلہ کو دیکھنے کے لئے پلنگ کے قریب آیا۔ وہ اپنے چہرے اور چھاتی کو گھنیرے بالوں میں چھپائے سو رہی تھی۔ معصوم اور پاکیزہ نیند نے اسے پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ نیند کی حالت میں اسکا چہرہ رات کی رانی کے پھول کی طرح شگفتہ و معطر تھا۔ اور شفق کی طرح رنگین و دلنشیں۔ نیند نے اسکے چہرے سے مکر و ریا کے کھوٹ کو دور کر دیا تھا اور اسکی جگہ عورت کی فطری اور بے میل معصومیت کی کشش پیدا کر دی تھی۔ جو رات کی تاریکی اور گہری نیند کے سکون کی وجہ سے بہت پر اثر معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ خوف وہراس پر محبت کا ہلکا ہلکا سرور غالب آنے لگا۔

کمرے سے لٹکتی ہوئی گھڑی نے دو بجائے۔ اس نے بجلی کا بٹن دبا کر کمرہ تاریک کر دیا۔ اور اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ سونا چاہتا تھا۔ لیکن نیند نہ آتی تھی۔ پریشانی کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اسکی روح جسم سے نکل کر ان پر اسرار تاریکیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے گی۔ ان پر اسرار تاریکیوں میں جن میں خوفناک سائے اور بھیانک خاموشیاں رینگ

رہی ہیں۔ اسکی پیشانی سے پسینہ گرنے لگا۔ اور دل کی دھڑکنیں بجھتی ہوئی شمع کی مانند مدہم سی ہوگئیں۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر تاریکی میں چاند نمایاں ہوا۔ اس کے روپہلی کناروں کے درمیان ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا بادل ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اس میں وہی سایہ حرکت کر رہا تھا۔ جو اس نے ابھی ابھی باغیچے میں دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتے ہوئے دیکھا تھا۔ پروفیسر مرزا نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ اور اس طرح کروٹیں بدلتے بدلتے نہ جانے کس وقت اسے نیند آ گئی۔

(۱۲)

امنڈ گھمنڈ کر آتے ہوئے کالے بادلوں نے رات کو اور زیادہ تاریک کر دیا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ کوٹھی کے باغیچے میں مہوت کھڑے ہوئے درختوں کی شاخیں یوں سرسرا رہی تھیں۔ جیسے سانپ پھنکار رہے ہوں۔ کمرے کی کھڑکی کھٹ سے کھلی۔ ہلکی ہلکی نیلی روشنی کھڑکی سے چھن کر تاریکی میں پھیلنے لگی۔ اور پھیلتے پھیلتے سامنے دیوار سے جا ٹکرائی کھڑکی کے قریب کھڑے ہوئے مولسری کے درخت کی سرسراتی ہوئی شاخوں کا سایہ دیوار پر پڑنے لگا۔

ایکا ایکی سرسراتی ہوئی شاخوں میں سے ایک نرم و نازک ہاتھ باہر نکلا۔ اور ہلنے لگا۔ جیسے شاخوں میں چھپا ہوا کوئی پرندہ پروں کو پھڑپھڑائے چند لمحوں تک ہاتھ یونہی ہلتا رہا۔ اسکی ہر جنبش میں ایک حسن ایک دلکشی ایک نغمہ تھا۔

ہاتھ سرسراتی ہوئی شاخوں میں چھپ گیا۔ ہلکی ہلکی نیلی روشنی کھڑکی کی طرف سمٹتی گئی۔ سمٹتی گئی اور دیوار پر تاریکی کے پردے

پھیلنے لگے۔ نرم و نازک ہاتھ اور سرسراتی ہوئی شاخوں کا سایہ روشنی کے ساتھ ہی دیوار پر سے محو ہو گیا۔

امنڈ گھمنڈ کر آتے ہوئے بادلوں نے رات کو اور زیادہ تاریک کر دیا۔ ہوا پہلے سے زیادہ تیز تیز چلنے لگی۔ مولسری کے درخت کے تنے کے پاس بکھرے ہوئے خشک پتوں پر آہستہ آہستہ پڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پتے چڑ چڑا رہے تھے۔

قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ اور دیوار کے قریب جا کر رُکے اسی دیوار کے قریب جسکے پیچھے رات کی پرسکوت تنہائیوں میں سلگتی ہوئی آہیں اور بے چین دھڑکنیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ جسکے سائے میں دو محبت بھرے دل فرشتوں کی طرح پیار کیا کرتے تھے۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹوں اور جھلملاہٹوں کے ساتھ ساتھ گنگنایا کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے۔ دھیمے دھیمے رسیلے سروں میں۔ اور ان کی آواز ہولے ہولے ابھرتے ہوئے چاند میں سما جاتی تھی۔ ستاروں کی روشنی میں گھل مل جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے۔ دھیمے دھیمے درختوں کی شاخیں لہراتیں۔ پرندے چہکتے۔ اور وہ شاخوں کی سرسراہٹوں اور پرندوں کی چہچہاہٹوں میں پیرتے ہوئے ایک ایسی فضا میں

پہونچ جاتے۔ جہاں فقط خوشبودار ہوائیں ہیں۔ اور انکا ترنم۔
بادل گرجا۔ بجلی کوندی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ چوڑیوں کی جھنکار
اور آنچل کی پھڑپھڑاہٹوں میں رینگتا ہوا ایک سایہ دیوار کے اس
پار تاریکیوں میں گم ہوگیا۔ بھیانک اور خاموش تاریکیوں میں۔

---

(۱۳)

گوشہ مشرق سے ہلکا ہلکا گلابی نور پھوٹ رہا تھا۔ پرندے
چہچہا رہے تھے۔ فضائیں ایک نئی زندگی سے معمور ہوتی جارہی تھیں
ہوا کے سرد سرد جھونکوں نے پروفیسر مرزا کو گہری نیند سے جگا دیا۔
آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اٹھا۔ انگڑائی لی۔ اور سگرٹ کیس اٹھانے
کے لئے میز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دفعتہً اسکی نظر میز پر رکھے ہوئے
ایک خط پر پڑی۔ حیرت و شوق سے کانپتا ہوا ہاتھ بڑھا کر خط اٹھا
لیا۔ اسے کھولا۔ اور پڑھنے لگا۔

خط بغیر کسی القاب و آداب کے اسطرح شروع ہوا۔

"حضرت آدم کے لئے جنت میں کیا کچھ موجود نہ تھا۔ لیکن جب تک انہیں اپنا ہم جلیس نہ ملا وہ افسردہ ہی رہے۔ بعینہ میں آپکی جنت میں رہتے ہوئے اس عرصہ تک افسردہ ہی رہی۔ جب تک کہ مجھے اپنا ہم جلیس نہ ملا۔ نفیس و نادر گہنے زرق برق پوشاکیں اور لونڈیاں باندیاں میری افسردگی کو دور نہ کر سکیں۔ پروفیسر مرزا اگر روح بے چین ہو تو نفیس و نادر گہنے بدن سے چھوتے ہی سانپ اور بچھو بنکر ڈستے ہیں۔ اور پھولوں کی سیج پر بھی نیند نہیں آیا کرتی۔ آپ میری پریشانی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ہر گھڑی بیتاب رہتے تھے۔ اور میں دل کی لگی کو کسی طرح ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔ آپ مجھے سینے سے لگا کر پیار کرنے پر مصر ہوتے تھے۔ اور میں اس پر آمادہ کے آپ سے اپنا دامن چھوڑا دھرتی کے کسی ایسے گوشے میں جا چھپوں۔ جہاں مجھے آپ کا مرجھایا ہوا چہرہ اور برفائے ہوئے بال نظر نہ آئیں۔ آپ اپنی محبت سے مجبور تھے میں دل سے۔

پروفیسر مرزا مجھے اسکا پورا پورا احساس ہے۔ کہ میرے چلے جانے کے بعد آپ کی جنت جسکی رونق فقط میرے دم سے قائم تھی، جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔ اس سے نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہوا کریں گی۔ لیکن کیا کروں اپنے بس میں نہیں ہوں۔ تیز و تند

لہروں پر حباب کی طرح بہتی جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں یہ تیز و تند لہریں یہ پرشور ہوائیں مجھے کہاں سے کہاں لے جائیں گی۔ لیکن اسکا غم ہی کیا۔ میں جہاں جاؤنگی خوش رہونگی۔ کنارہ ہو یا منجدھار۔ وہ میرے ساتھ رہے میری کشتی حیات کا کھویا۔ مجھے دنیا کی بڑی سے بڑی آفت بھی پریشان نہ کر سکے گی۔ ہر حالت میں اور ہمیشہ خوش رہونگی۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھاؤنگی اور انہیں میں دنیا بھر کی نعمتوں کا مزہ لونگی۔ گھاس پھوس کی جھونپڑی میں رہونگی اور سنہرے سپنے دیکھونگی۔ وہ جھونپڑی مجھے آپ کی جنت سے کہیں زیادہ عزیز ہوگی۔

پروفیسر مرزا وہ لوگ کتنے بیوقوف ہیں۔ جو ہاتھ سے ہاتھ ملا دیتے ہیں۔ لیکن دل سے دل ملانے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیدیا لیکن دل آپکے نہ دے سکے۔ میرے دل کو آپ کے دل سے ملانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسے ماں باپ بھی کسی کام کے نہیں۔ جو اپنی بیٹی کو گڑیا سمجھتے ہیں۔ جس نے دولت کے انبار دکھائے۔ اسے ہی کھیلنے کو دیدی۔ اپنے خون اپنے گوشت کی ذرا پرواہ نہیں کرتے۔ دولت کا دم بھرتے ہیں۔ اور اگر مصیبت زدہ بیٹی منہ کھولے۔ فریاد کرے۔ تو بے شرم بے حیا گستاخ شوخ دیدہ

بدکار، نحشہ اور نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں۔ بیٹی کھائے تو اپنی مرضی کا کھائے۔ پہنے تو اپنی مرضی کا پہنے۔ اور جب شوہر کا سوال پیدا ہو تو اسکی مرضی کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں ماں باپ کی مرضی عجیب بات ہے۔ جسکے ساتھ عمر گذارنی ہے۔ اسے ماں باپ پسند کرتے ہیں۔ کون ہے جو ان بگڑے ہوئے دماغوں کو درست کرے۔

پروفیسر مرزا اب مجھے بھول جائیے۔ ہمیشہ کے لئے بھول جائیے دل سے فراموش کر دیجئے۔ مجھے یاد کرنے سے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا آپ زندگی کی تمام آسودگیاں کھو بیٹھینگے۔ جینا دشوار ہو جائے گا نہ ہنسنے پر اختیار ہوگا نہ رونا اپنے بس میں۔ دنیا بھر کی مایوسیاں ہونگیں اور آپ آنکھیں ہر وقت ساون کی گھٹاؤں کی طرح برسا کریں گی۔ سینے میں آگ سی سلگتی رہے گی۔ کیا آپ مجھ ایسی ہیوفا عورت کے غم میں اپنی یہ حالت بنانا گوارا کرینگے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ سمجھے ایک کھوٹا سکہ سمجھئے جو آپ کی گرہ سے گم ہو گیا۔ جس کا سوائے بوجھ کے اور کچھ فائدہ ہی نہ تھا۔ اچھا ہوا گر گیا ؎

نظر سے گر چکے کی آبرو کیا
گرہ سے گم گئے کی جستجو کیا

مجھے اپنی نظر سے گرا دیجئے۔ میں نے آپکے ساتھ دغا کی ہے۔ میری بیوفائی ایک ایسا جرم ہے۔ جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس جرم کی سزا یہ ہے۔ کہ آپ مجھے اتنی ہی نفرت کرنے لگیں جتنی کہ آپ کو میرے ساتھ محبت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے مشورے پر عمل کریں گے میری بات کو گرہ میں باندھ لینگے۔ اور میری تلاش میں ایک قدم بھی اٹھا کر نہ رکھینگے میں نے آپکی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ آپ کے وقار کو ٹھیس لگائی ہے۔ میں نے آپ کی سچی محبت کی قدر نہیں کی۔ کتنا بڑا جرم کیا ہے میں نے۔ جسکو آپ اپنی روح کی رونق سمجھتے تھے۔ وہ بدسرشت بدخو دغاباز اور وفا نہ آشنا ثابت ہوئی۔ بھول جائیے۔ مجھے بھول جائیے۔ اگر آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو میں جب تک زندہ رہونگی آپ کو اچھے لفظوں سے یاد کرونگی۔ اور آپکی عنایات کی مشکور رہونگی۔

خط کا آخری جملہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ پروفیسر مرزا کی نظریں پوری توجہ کے ساتھ جمیلہ کی چارپائی کی طرف اٹھیں۔ بستر خالی پڑا تھا۔ پروفیسر مرزا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یہی جان پڑا کہ زبردست زلزلے کے شدید جھٹکوں سے پاش پاش ہوتی جا رہی ہے۔ اسکے چہرے پر زردیاں کھنڈ گئیں۔ پیشانی پسینے سے شرابور ہو گئی۔ آنکھوں سے شعلے ٹپکنے لگے تھر تھر کانپ رہا تھا سانس پھول گیا تھا۔ جیسے کئی میل سے بھاگتا چلا

آرہا ہے۔ دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں ٹہلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ اور چند لمحوں تک خیالات کی تیز تیز لہروں پر اس کشتی کی طرح ہچکولے کھاتا رہا۔ جسکے بادباں آندھی کی یورش سے پھٹ گئے ہوں۔ پھر نامعلوم دل میں کیا آئی۔ کہ وحشت میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور جمیلہ کی تلاش میں کوٹھی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہر جگہ دیکھا۔ ہر طرف ڈھونڈا۔ لیکن نازنین و نازآفریں جمیلہ کہیں نظر نہ آئی۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر جستجو میں تھک کے چوٹ کھائے ہوئے جانور کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کی طرف چلا جیسے زمین و آسمان کا سارا بوجھ اسکے کندھوں پر رکھدیا گیا ہے۔ اس کے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ برپر بلند پہاڑوں پر گرنے والی برف اس پر گر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیرگی گھومنے لگی۔ اسکی نظروں میں زمین و آسمان کی تمام روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ ناتوانی کی وجہ سے کئی دفعہ گر کر اٹھا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آیا۔ دروازے کے قریب ہی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اسکے خیالات نہ جانے اسے کہاں سے کہاں لئے جا رہے تھے۔ کافی دیر تک پیشانی پر ہاتھ رکھے نقش حیرت بنا کھڑا رہا۔ جیسے زندگی کی بازی گاہ میں سب کچھ ہار گیا ہے۔

یکایک تن بدن میں اضطراب و اضطرار کی لہر پھر اٹھی۔ پروفیسر

مرزا سے ایک جھرجھری لی۔ سرد آہ بھرتے ہوئے وہاں سے ہٹا۔ اور کھڑکی کی طرف آیا۔ ابھی کھڑکی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ کہ سامنے دیوار پر جمیلہ کی چند مبہم و فرسودہ تصویریں نظر آئیں۔ بس وہیں کھڑا ہو گیا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔ دیکھتا رہا۔ بڑے غور سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ آخر دل سے رہا نہ گیا۔ دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بھوکے شیر کی طرح دانت پیستا ہوا دیوار کی طرف لپکا۔ قریب پہونچا تو سوائے اپنے سائے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ حرماں نصیب بوڑھا اپنا سا منھ لیکر رہ گیا۔ وہاں دھرا ہی کیا تھا۔ وہ تو تخیل کی شعبدہ بازی تھی۔ تخیل کی شعبدہ بازی۔

کھڑکی سے چھن چھن کر آتی ہوئی شوخ و شنگ کرنوں کو شرارت سوجھی۔ اپنی نرم و نازک انگلیوں سے پروفیسر مرزا کے پپوٹوں کو گدگدانے لگیں۔ آنکھیں ساون کی گھٹاؤں کی طرح برسنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اشارہ پاتے ہی برس پڑیں۔ پروفیسر مرزا حسرت و اندوہ کے عالم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اسقدر رویا کہ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا ستم ایجاد ستم ظریف قسمت تیری ستم ظریفیوں کی کوئی انتہا بھی ہے کہ نہیں؟ تیرے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لئے پروفیسر مرزا ہی دنیا میں رہ گیا ہے کیا؟ اس نے تیرا

کیا بگاڑا ہے ؟ تجھے اسکے ساتھ اتنی عداوت کیوں ہے ؟ پہلی بیوی دی بانجھ۔ خشک بنجر کھیتی۔ سیمنٹ ڈالی جس میں نہ پھول لگے نہ کونپلیں پھوٹیں۔ اسی دکھ سے دوسری شادی کی۔ دنیا بھر کی نظروں میں تماشا بنے۔ بڑھاپے کی مٹی پلید کی۔ لیکن تیرا پتھر دل نہ پسیجا۔ تیری ستم ظریفیاں نہ گئیں۔ تیرے ہاتھ تیر چلاتے چلاتے نہ تھکے۔ تیری چٹکیوں پر آبلے نہ ابھرے۔ پہلے زخم ابھی اچھے بھی نہ ہوئے تھے کہ تازے اور لگا دئے۔ اپنے ظلم وستم کو دیکھ اور پروفیسر مرزا کی بیکسی پر غور کر۔ بیرحم سفاک۔ ظالم تو نے زندگی کی ساری رونقیں تو چھین ہی لی تھیں۔ اسی پر اکتفا کیا ہوتا۔ کسی کی عزت کو خاک میں ملا کے تجھے کیا مل گیا ؟ کسی کی پگڑی اچھال کر تیرے ہاتھ کیا آیا ؟ خیر اچھا ہوا کہ تیرے ظلم وستم کے ترکش میں یہ آخری تیر بھی باقی نہ رہا۔

کچھ دیر کے بعد پروفیسر مرزا کی طبیعت غم و اندوہ کے جھٹکے پر غالب آئی۔ نحیف وکمزور آواز سے کہنے لگا۔

" میرا خواب سچا نکلا۔ وہ چلی گئی۔ جسکی مسکراہٹیں میری ہستی میں چراغاں کیا کرتی تھیں۔ وہ چلی گئی۔ اب زندگی زندگی نہیں۔ ایک خواب ہے پریشاں۔ ایک زخم ہے کبھی نہ اچھا ہونے والا۔ اسکے بغیر زندہ رہنا ایک ایسا گناہ کرنا ہے جسکا کفارہ کروروں برس تک جہنم کے

شعلوں میں جلتے رہنے کے بعد بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ جمیلہ دغا باز جمیلہ تو نے میری سچی محبت کی ذرا قدر نہیں کی۔ تو نے میری ناک پانچوں میں کاٹ دی۔ مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ دنیا تجھے کیا کہے گی؟ میرے متعلق کیسی کیسی رائیں قائم کی جائیں گی؟ بیوفا جمیلہ تو مجھے تنہائی و بیکسی کے عالم میں تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئی؟ کیا یہی حق رفاقت تھا؟ جفا پیشہ تو میری روح کی راحت اور دل کی رونق تھی۔ تو نے ہی میرے ساتھ دغا کی۔ اپنے محسن کے ساتھ کبھی ایسا بھی کیا کرتے ہیں؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ تو مار آستین ہے۔ تیری اور سانپ کی سرشت میں ذرا بھی فرق نہیں۔ تیرے پھول کی پنکھڑی کے سے ہونٹوں میں مکر و فریب کا زہر بھرا ہوا ہے۔ اور تیری روح اتنی ہی تاریک ہے جتنا کہ تیرا چہرہ روشن ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد پروفیسر مرزا خاموش ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ یہ وسیع دنیا اسے تنگ و تاریک نظر آنے لگی۔ اسے اپنا سر چھپانے کو اس میں کوئی گوشہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو دھرتی کے سینے میں چھپی ہوئی آگ اسے پھونک دیتی۔ متحرک آسمان اسکے سر پر ٹوٹ پڑتے۔ متلاطم سمندر اسے اپنی بے پایاں گہرائیوں میں چھپا لیتے۔ اور وہ رسوائی سے بچ

جاتا۔ نہ چور دیکھے نہ کتا بھونکے۔ نہ وہ ہوتا نہ جگ ہنسائی ہوتی۔ لیکن یہ امید بھی تو بر نہیں آتی تھی۔ زندگی اور اسکی رنگینوں سے متنفر پروفیسر مرزا نے آسمان کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ دھرتی کے سینے میں چھپی ہوئی آگ سے التجائیں کیں۔ متلاطم سمندروں کو پکارا۔ لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ برے وقت میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ کوئی بھی اسکی مدد کے لئے تیار نہوا۔ سوائے اسکے اور کچھ چارہ ہی نہ تھا۔ کہ دنیا کی باتوں کا ذرا خیال نہ کرے۔ زبان کے ہوتے ہوئے کچھ نہ کہے کانوں کی موجودگی میں کچھ نہ سنے۔ گونگا اور بہرہ بن جائے۔ اور زندگی کے باقی ایام جسطرح گذریں گذارے۔ خیر یہ تو ہوا لیکن اسکے دل سے جمیلہ کا خیال مٹے تو کیسے مٹے؟ وہ بے وفا ہی سہی۔ پروفیسر مرزا تو بے وفا نہیں۔ وہ اسے آخری دم تک یاد کرے گا۔ اس کی تصویر اسکے دل پر کھچ چکی ہے۔ جسے فقط موت کے ہاتھ ہی مٹا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ چاند اپنی روشنی کھو دے۔ ستاروں کی چمک جاتی رہے۔ آسمان گردش کرنا بند کردیں۔ دھرتی اپنے مرکز سے پیچھے ہٹ جائے۔ دریا اپنی گذرگاہ بدل ڈالیں۔ چکور کو چاند کا خیال نہ رہے۔ بھونرہ کلی سے التفات ہٹالے۔ اور پروانہ شمع پر نچھاور ہونا بھولے۔ لیکن پروفیسر مرزا جمیلہ کو نہیں

بھول سکتا۔ وہ جب تک زندہ رہے گا اسے یاد کرے گا۔ جمیلہ اسے آخری دم تک یاد رہے گی۔ وہ اسکے سانس سانس میں بس گئی ہے۔ تو پھر اب کیا کیا جائے؟ وہ یہی سوچ رہا تھا۔ جمیلہ واپس تو آ نہیں سکتی۔ اسکے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ نفسانی تقاضوں سے مجبور ہو کر گھر سے بھاگی ہوئی عورت۔ ٹوٹے ہوئے تارے نکلا ہوا سانپ اور گزرے ہوئے لمحے واپس نہیں آیا کرتے۔ اور پروفیسر مرزا کا گھاؤ اچھا ہو تو کیسے ہو؟ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے مستقبل کی دھندلی سی تصویریں گھومنے لگیں۔ بختوں جلا بوڑھا دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ وقت دور نہیں جبکہ جمیلہ کی جدائی میں اسے ہر وقت روتے رہنا ہوگا۔ اور ہر وقت روتے رہنے کا نتیجہ جنون ہے۔ جنون۔ گریبان چاک۔ سر میں خاک پاؤں زخمی آنکھیں اداس۔ چہرہ فق فق۔ شہر کی گلیاں۔ بچوں کی خشت باری۔ لوگوں کے آوازے، پھبتیاں اور پروفیسر مرزا۔ قسمت نے اسکے لئے یہی زندگی تجویز کی تھی۔ لیکن وہ اس زندگی سے سخت متنفر تھا۔ جب زندگی یہ صورت اختیار کرے تو زندہ رہنا گناہ ہے۔ جرم ہے۔ وہ اس سے پیشتر ہی اس چھوٹی سی نبض کی حرکت بند کر دے گا۔ اس چھوٹی سی نبض کی حرکت

جسکا نام زندگی ہے۔ اور ایک گہری نیند سو جائے گا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بنسری۔

"مبارک ہے یہ ارادہ۔ آفرین ہے اس اقدام کو" پروفیسر مرزا چونک پڑا۔ دل کڑا کر کے بولا "یہ میری قسمت ہی میں نہ تھا۔ کہ اپنی امیدوں کو پھلتے پھولتے دیکھتا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ دنیا میں انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔ میری روح ایک خلش ناتمام لئے ہوئے اس دنیا سے جائے گی۔ اور اس کی خلش ہی سے"

جملا ناتمام ہی رہا۔ پروفیسر مرزا کی زبان خود بخود رک گئی۔ لب آپس میں پیوست ہو گئے۔ جیسے سی دیئے گئے ہیں۔ اسے یہی جان پڑا کہ کمرے کی دیواریں اس کی طرف تیزی سے بھاگی چلی آتی ہیں اسے ایک چکر آیا۔ ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالے صوفے پر بیٹھ گیا۔

کھڑکی سے باہر آفتاب نور کے دھارے اگلتا ہوا خلا میں ابھر رہا تھا۔ لیکن پروفیسر مرزا کی دنیا میں شام ہو رہی تھی ✱